تدبّرِ قرآن

۸

الانفال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود

سورۂ انفال دوسرے گروپ کی تیسری سورہ ہے۔ یہ مدنی ہے۔ اس میں مسلمانوں کو تقویٰ، باہمی اخوت و ہمدردی اور اللہ و رسول کی اطاعت کی اساس پر منظم اور جہاد کے لیے تیار ہونے کی دعوت دی گئی ہے تاکہ وہ اس ملت ابراہیمؑ اور مرکز ملت ابراہیمیؑ۔ بیت اللہ۔ کی امانت و تولیت کے اہل ہو سکیں جو اب قریش کی جگہ ان کی تحویل میں دی جانے والی ہے۔

پچھلی دونوں سورتوں۔ انعام اور اعراف۔ میں آپ نے دیکھا کہ قریش کو عقائد، اعمال اور اخلاق ہر پہلو سے اس امانت کے لیے نااہل ثابت کر دیا ہے۔ اب اس سورہ میں مسلمانوں کی تطہیر و تنظیم، ان کی اصلاح اور تزکیہ کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے کہ غزوۂ بدر کے دوران میں بعض کمزور مسلمانوں کی طرف سے جو کمزوریاں، اللہ و رسول کی اطاعت اور ایمان و توکل کے منافی، صادر ہوئی تھیں، ان پر پہلے گرفت فرمائی ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو ان کمزوریوں سے پاک کریں۔ پھر ان غیبی تائیدات کی طرف اشارہ فرمایا جو غزوۂ بدر کے دوران میں ظاہر ہوئیں تاکہ مسلمانوں کا اعتماد اللہ پر مضبوط ہو اور جو لوگ ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے ہیں وہ یکسو ہو کر آگے کے مراحل کے تقاضے پورے کرنے کے اہل ہو سکیں۔ پھر مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد پر ابھارا ہے اور یہ وعدہ فرمایا ہے کہ اگر انھوں نے کمزوری نہ دکھائی تو جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ حریف کی سازشوں کے سارے تار و پود بکھر جائیں گے۔ بیچ بیچ میں قریش کو بھی تنبیہ فرمائی ہے کہ بدر کے واقعہ میں تمھارے لیے بڑا سبق ہے، تمھارے لیے اب بہتر یہی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ یاد رکھو کہ اگر تم نے مزید کوئی شرارت کی تو پھر منہ کی کھاؤ گے، اب تک تمھارے ساتھ جو رعایت ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ رسولؐ تمھارے اندر موجود تھا۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب تک رسولؐ قوم کے اندر موجود رہتا ہے اس وقت تک قوم پر عذاب نہیں آتا لیکن اب جب کہ رسول تمھارے اندر سے ہجرت کر چکا ہے، تمھاری امان اٹھ چکی ہے اور تم ہر وقت عذاب الٰہی کی زد میں ہو۔ تمھارا یہ غرہ بالکل بے جا ہے کہ تم بیت اللہ کے متولی اور مجاور ہو، بیت اللہ کے متولی ہونے کے اہل تم نہیں ہو،

تم نے ابراہیم کے بنائے ہوئے اس گھر کا مقصد بالکل برباد کر کے رکھ دیا بلکہ اس کی حرمت کو بٹہ لگایا، تم جس نماز اور عبادت کے مدعی ہو یہ نماز عبادت نہیں بلکہ محض مذاق ہے، تمہارے لیے سلامتی کی راہ یہ ہے کہ تم توبہ اور اصلاح کی روش اختیار کرو ورنہ یاد رکھو کہ اب اس حرم کی سرزمین پر نہ اہلِ ایمان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کا کوئی موقع باقی چھوڑا جائے گا اور نہ اللہ کے دین کے سوا یہاں کوئی اور دین باقی رہنے دیا جائے گا۔

آگے بدر کے واقعات ہی کی روشنی میں مسلمانوں کی حوصلہ افزائی اور کفار کو تنبیہ کرتے ہوئے بات ان اعتراضات کے جواب تک پہنچ گئی ہے جو قریش نے بدر میں شکست کھانے کے بعد لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کے لیے اٹھائے۔ بدر سے پہلے تک تو وہ مسلمانوں کی کمزوری و مجبوری کو اسلام کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے لیکن بدر میں اپنی کمزور مسلمانوں کے ہاتھوں جب پٹ گئے تو یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر کس طرح ہو سکتے ہیں، بھلا پیغمبر کا کہیں یہ کام ہوتا ہے کہ اپنی ہی قوم کو باہم لڑا دے۔ اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرائے، پھر ان کو قید کرے، ان سے فدیہ وصول کرے اور ان کا مال و اسباب غنیمت بنا کر کھائے اور کھلائے؟ اس اعتراض سے بھی کمزور قسم کے لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہو سکتے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کو بھی صاف کیا اور آخر میں انصار اور مہاجرین کو باہمی اخوت کی تعلیم و تلقین فرمائی کہ دونوں مل کر کفر کے مقابلہ میں بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہوں۔

اگرچہ سورہ کا نظام سمجھنے کے لیے یہ اجمالی نظر بھی کافی ہے لیکن ہم مزید وضاحت کے لیے سورہ کے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) مالِ غنیمت کی تقسیم سے متعلق بعض کمزور قسم کے مسلمانوں کی طرف سے معترضانہ نوعیت کے سوال کا حوالہ اور اس کا اجمالی جواب۔ اس اعتراض کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو اس امر کی ہدایت کہ اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرتے رہو، اپنے آپس کے تعلقات رشک و رقابت سے پاک رکھو، اللہ و رسول کی ہر مرحلے میں اطاعت کرو۔ سچے اور پکے اہلِ ایمان کی خصوصیات کا بالاجمال حوالہ اور ان کے لیے اللہ کے ہاں اجرِ عظیم کا وعدہ۔

(۵-۸) کمزور قسم کے مسلمانوں کی ایک اور کمزوری کی طرف اشارہ جو جنگِ بدر کے لیے نکلتے ہوئے ان سے صادر ہوئی کہ باوجودیکہ ان پر یہ بات واضح تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نکلنا قریش کی اس فوج سے مقابلہ کے لیے ہے جو تجارتی قافلہ کی حفاظت کا بہانہ بنا کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتی ہے لیکن وہ فوج کے مقابلہ سے ڈرتے رہے اور انھوں نے پورا زور اس بات پر لگایا کہ آنحضرت تجارتی قافلہ کا رخ کریں تاکہ بغیر کسی خطرے کے لقمۂ تر ہاتھ آئے حالانکہ اللہ و رسول کا منشا یہ تھا کہ حق کا بول بالا ہو اور باطل کا زور ٹوٹے جو اسی صورت میں متصور تھا جب قریش کی عسکری قوت مجروح ہو نہ کہ ایک غیر مسلح تجارتی قافلہ۔

(۹-۱۴) مسلمانوں کی تقویت اور حوصلہ افزائی کے لیے ان غیبی تائیدات کا حوالہ جو بدر کے موقع پر ظاہر ہوئیں۔ مسلمانوں کی دعا کے جواب میں بروقت ہزار فرشتوں کی مدد کا وعدہ۔ برسرِ موقع میدانِ جنگ میں اطمینان کی نیند اور بارش کے نزول سے مساعد حالات کا ظہور۔ امدادی فرشتوں کو یہ ہدایت خداوندی کہ مسلمانوں کا حوصلہ بحال رکھو، کفار کو مرعوب کردو اور ان کے پرخچے اڑا دو۔

(۱۵-۱۸) مذکورہ تائیدات غیبی کی روشنی میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ کفار سے جب مقابلہ ہو تو کبھی پیٹھ نہ دکھاؤ، منظم فوج کشی کی صورت میں پیٹھ دکھانے والے خدا کے غضب اور جہنم کے عذاب کے سزاوار ٹھہریں گے۔ مسلمان جب خدا کی راہ میں لڑتے ہیں تو صرف وہی نہیں لڑتے بلکہ ان کی طرف سے خدا بھی لڑتا ہے اور اہلِ ایمان کے لیے جوہر دکھانے کے مواقع فراہم کرتا ہے، بدر میں اس حقیقت کا مشاہدہ تم کر چکے ہو۔ اور یہ جو کچھ ہوا ہے اس پر بس نہ سمجھو، آئندہ اللہ ان کفار کی ساری چالیں بے کار کر دے گا۔

(۱۹) قریش کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برسرِ موقع تنبیہ کہ تم کہتے تھے کہ اس جنگ میں جس کو فتح حاصل ہوگی وہ برسرِ حق سمجھا جائے گا تو دیکھ لو فتح ظاہر ہو گئی۔ اب بہتر ہے کہ کسی مزید شرارت کی جرأت نہ کرو۔ اگر تم باز نہ آئے، پھر شرارت کی تو یاد رکھو ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں، ہم بھی اپنی شان پھر دکھائیں گے اور یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ تمہارے لاؤ لشکر کی کثرت کچھ کام نہ آئے گی، مسلمانوں کے پہلو پر ہم ہیں۔

(۲۰-۲۳) مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ پوری وفاداری کے ساتھ اللہ و رسول کی اطاعت کرو، رسول کی عین موجودگی میں اس سے انحراف نہ اختیار کرو۔ یہ روش ان یہود کی ہے جو کہتے تھے کہ ہم نے مانا لیکن مانتے نہیں تھے۔ اللہ کے نزدیک سب سے بدتر جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو سوچنے سمجھنے سے عاری ہیں۔ اللہ نے ان میں کوئی صلاحیت نہیں پائی۔ اس وجہ سے ان کو قبول حق سے محروم کر دیا۔ توفیقِ الٰہی انہی لوگوں پر کارگر ہوتی ہے جو اپنے اندر اثر پذیری اور قبولِ حق کی صلاحیت زندہ رکھتے ہیں۔

(۲۴-۲۶) مسلمانوں کو تنبیہ کہ رسول کی دعوت تمہارے لیے روح و قلب کی زندگی کی دعوت ہے تو اس دعوت کی قدر کرو اور اس پر لبیک کہو۔ اگر تم نے کمزوری دکھائی اور تذبذب کے شکار رہے تو یاد رکھو کہ آدمی اور اس کی قوتِ ارادی کے درمیان سنتِ الٰہی حائل ہو جاتی ہے۔ پھر وہ خیر کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں جو خرابیاں کچھ مخصوص لوگوں کی طرف سے ظاہر ہوتی ہیں اگر دوسرے ان کی اصلاح کی کوشش نہ کریں تو ان کے برے نتائج کی لپیٹ میں اچھے برے سب آ جاتے ہیں۔ اسلام کے مستقبل کی طرف سے کسی تذبذب اور اندیشے میں مبتلا نہ ہو۔ تم اس ملک میں تھوڑے تھے۔ خدا نے تمہیں زیادہ کیا اور اپنی تائید و نصرت سے تمہیں نوازا۔ اسی خدا پر بھروسہ رکھو وہ آگے کے مراحل میں بھی تمہارا کارساز ہے۔

(۲۷-۲۹) کمزور قسم کے مسلمانوں کو تنبیہ کہ اللہ اور رسول سے عہدِ اطاعت و وفاداری کر چکنے کے بعد بے وفائی نہ کرو۔ مال و اولاد کی محبت اللہ و رسول کی محبت کے تقاضوں میں مانع نہ ہو۔ یہ چیزیں فتنہ ہیں۔ ان

فتنوں میں پڑ کر اس اجرِ عظیم کو ضائع نہ کرو جو اللہ کے پاس اس کے وفادار بندوں کے لیے محفوظ ہے۔ جو لوگ محبت دنیا کو اپنے اوپر غالب نہ ہونے دیں گے اللہ ان کے آگے سے باطل کے تمام حجابات چاک کر دے گا اور ان کو اپنی مغفرت سے نوازے گا۔

(۳۰-۳۷) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ان تائیدات ربّانی کی یاد دہانی جو قریش کی مسلسل سازشوں کے مقابل میں ظاہر ہوئیں اور جن سے ان کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے، ان کی ساری چالیں شکست کھا گئیں اور خدا کی تدبیر غالب رہی۔ وہ قرآن کو اگلوں کا فسانہ کہتے تھے لیکن اس کا اُملا ان کے لیے واقعہ ثابت ہوا۔ وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اگر تم پیغمبر برحق ہو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسیں یا کوئی اور عذاب آئے تو ہم مانیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے ان پر عذاب نہیں بھیجا کہ تم ان کے اندر موجود تھے لیکن اب جب کہ تم ان کے اندر سے نکل چکے ہو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ عذاب سے محفوظ رہیں۔ وہ اپنے آپ کو مسجد حرام کا متولی سمجھتے ہیں لیکن وہ اس کے متولی کہاں سے ہوئے؟ اس کے متولی تو صرف خدا سے ڈرنے والے بندے ہی ہو سکتے ہیں۔ ان مدعیوں کو اللہ کے اس گھر کی اصل تاریخ اور اس کے مقاصد تعمیر کا کوئی علم نہیں، تالی پیٹنا اور سیٹی بجانا ان کی نماز ہے، بھلا اس مسخرا پن کو نماز ابراہیمی سے کیا علاقہ؟ یہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنے اور اسلام کو شکست دینے کے لیے بڑی دلیری سے جو اپنے مال خرچ کر رہے ہیں اس کا کچھ حاصل نہیں۔ یہ سارا خرچ ان کے لیے موجب حسرت و اندوہ بنے گا۔ اب ان کے آگے صرف جہنم ہے۔ خدا اس سارے ذخیرۂ خبیث کو اکٹھا کر کے دوزخ کی آگ میں جھونک دے گا۔

(۳۸-۴۰) کفار قریش کو تنبیہ کہ اگر وہ اپنی شرارتوں سے باز آجائیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔ اگر انھوں نے اپنے رویے کی اصلاح کر لی تو ان کی پچھلی غلطیاں معاف کر دی جائیں گی اور اگر وہ باز نہ آئے تو یاد رکھیں کہ ان کا بھی وہی حشر ہونا ہے جو ان سے پہلے انبیاء کو جھٹلانے والی قوموں کا ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ کمزور مسلمانوں پر ان کے جبر و ظلم کا خاتمہ ہو جائے اور اس سرزمین پر اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین باقی نہ رہ جائے۔ اگر یہ باز آگئے تو ان کے لیے بہتر ہے، اگر باز نہ آئے تو خدا تمھارا مددگار ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

(۴۱-۴۴) مال غنیمت کی تقسیم سے متعلق سوال مذکورہ آیت ۱ کا تفصیلی جواب اور مسلمانوں کو یہ تنبیہ کہ اس تقسیم کو خوش دلی سے قبول کریں۔ اللہ و رسول کے فیصلہ پر راضی رہنا ہی سچے ایمان کی علامت اور اس کا تقاضا ہے۔ یہ یاد رکھو کہ بدر کے دن تمھیں جو کامیابی حاصل ہوئی یہ تمھاری اپنی تدبیر اور تمھارے اپنے تدبر کا کرشمہ نہیں تھی بلکہ یہ ساری اسکیم اللہ کی بنائی ہوئی تھی۔ یہ اسی کی کارسازی تھی اور اس نے ٹھیک اس وقت تمھاری فوج کو اس وادی کے ایک سرے پر پہنچا دیا جس کے دوسرے سرے پر دشمن کی فوجیں پہنچ چکی تھیں

اگر تم ایک دوسرے کو الٹی میٹم دے کر نکلتے تو تمہارا یہ عین وقت پر دشمن کے مقابلہ کے لیے پہنچ جانا ممکن نہ تھا۔ یہ اللہ کی اسکیم تھی جو پوری ہوئی۔ اس نے یہ چاہا کہ تمہارے اور قریش کے درمیان ایک ایسا معرکہ ہو جائے جو حق و باطل کے درمیان ایک امتیاز پیدا کر دے تاکہ اس کے بعد جو کفر پر جمے رہنا چاہیں ان پر حجت قائم ہو جائے اور جو اسلام کو اختیار کریں ان کو ایک روشن دلیل مل جائے۔ یہی رمز تھا کہ خدا نے کفار کی فوج کو پیغمبر کی رؤیا میں کم دکھایا تاکہ مسلمانوں میں ہراس نہ پیدا ہو اور وہ ان سے ٹکر لینے کے لیے پُرحوصلہ رہیں اور پھر یہی رمز تھا کہ جب تمہاری اور ان کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو تمہاری نگاہوں میں خدا نے ان کو حقیر دکھایا اور ان کی نگاہوں میں تم کو کم دکھایا تاکہ ٹکر لینے سے کوئی بھی نہ جھجکے اور وہ معرکہ واقع ہو ہی جائے جو حق و باطل کے درمیان ایک فرق بن کر نمایاں ہو۔ یاد رکھو کہ سارے معاملات کا سررشتہ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔

(۴۵-۴۶) مسلمانوں کو آئندہ کے لیے نصیحت کہ بدر کی اس جنگ میں تم نے دیکھ لیا کہ اصل کارساز خدا ہے تو جب کفار کے کسی گروہ سے تمہاری ٹکر ہو جائے تو پورے جماؤ اور پوری ثابت قدمی سے لڑو اور اپنے مرجع حقیقی خدا کو زیادہ سے زیادہ یاد کرو۔ یہی فلاح کا راستہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی پوری اطاعت کرو۔ کسی امر میں اختلاف نہ کرو ورنہ ہزیمت اٹھاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ دوسری چیز جو اطاعت کے ساتھ مطلوب ہے وہ ثابت قدمی اور پامردی ہے۔ خدا انہی کے ساتھ ہوتا ہے جو اس کی راہ میں ثابت قدمی دکھاتے ہیں۔

(۴۷-۴۹) ان کفار کی روش سے بچتے رہنے کی ہدایت جو اکڑتے، اتراتے اور اپنے کر و فر کی نمائش کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں اترے تھے اور مقصود جن کا لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا تھا، ان لوگوں کو پتہ نہیں کہ خدا کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی، سب کا زور و زر اور سب کا کرّ و فر اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ ان لوگوں کو شیطان نے پٹی پڑھائی تھی کہ آج تمہارا کوئی مدمقابل نہیں اور میں تمہارا ساتھی ہوں لیکن جب اس نے میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھا تو اپنی روایت کے مطابق دُم دبا کر بھاگا کہ میں تو اللہ رب العٰلمین سے ڈرتا ہوں (یہاں ایک لطیف تعریض یہود کی طرف بھی ہے، تفسیر میں اس کی وضاحت آگے آئے گی) منافقین اور حاسدوں کے اس طعنہ کا جواب جو وہ مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کے لیے دیتے تھے کہ ان کو ان کے دین کے غرّے نے نتائج و عواقب سے بے پروا کر دیا ہے، یہ ہاتھوں سے گنے کھانے چلے ہیں۔ ان منافقین کو پتا نہیں تھا کہ خدا کا بھروسہ بڑی چیز ہے، خدا عزیز و حکیم ہے۔

(۵۰-۵۴) قریش کو تہدید کہ یہ بدر میں جو کچھ پیش آیا ہے یہ تو محض نقد عاجل ہے، مرنے کے بعد جو کچھ تمہارے سامنے آنے والا ہے وہ بڑی ہی سخت چیز ہے اور یہ جو کچھ ہوا ہے یا جو کچھ ہو گا یہ تم پر کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ تمہارے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ اپنے

رویے کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنا رویہ نہ بدل لے۔ تم سے پہلے قوم فرعون اور دوسری قوموں کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ نے یہی معاملہ کیا۔ جب انھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی خدا نے ان کو تنبیہ کی۔ پھر جب اس تنبیہ کے بعد بھی وہ سرکشی سے باز نہ آئے تو خدا نے ان کو اپنے عذاب میں دھر لیا اور وہ فنا کر دیے گئے۔ اسی طرح بدر کا واقعہ تمھارے لیے ایک تنبیہ ہے۔ اگر اس سے تم نے سبق نہ لیا تو تمھارے سامنے بھی وہی انجام آجائے گا جو فرعون اور اس کی قوم کے سامنے آیا۔

(۵۵-۶۲) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ جن گروہوں نے تم سے معاہدہ کر رکھا ہے لیکن وہ اس کا احترام نہیں کر رہے ہیں بلکہ جب کوئی موقع ان کو ہاتھ آجاتا ہے معاہدے کو توڑ دیتے ہیں، ان کے ساتھ ذرا رعایت نہ کرو۔ اگر کسی جنگ میں وہ تمھارے مقابل میں آئیں تو ان کو ایسا سبق دو کہ جو اُن کی پشت پناہی کر رہے ہیں اُن کے بھی ہوش درست ہو جائیں۔ یہ لوگ تمھارے قابو سے باہر نہیں نکل سکتے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے مقدور بھر اپنی فوجی قوت بڑھائیں تاکہ اللہ کے اور اپنے ان دشمنوں کو مرعوب رکھ سکیں جن میں سے بعض ظاہر ہیں اور بعض ابھی پس پردہ ہیں۔ مسلمان اس مقصد کے لیے جو بھی خرچ کریں گے خدا کے ہاں سب پورا کر دیا جائے گا، کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ہاں اگر یہ صلح کے خواہشمند ہوں تو تم بھی صلح سے گریز نہ کرو۔ اللہ پر بھروسا کر کے ان سے صلح کر لو۔ اگر اس مصالحت سے ان کا مقصد تم کو دھوکا دینا ہو تو تمھارے لیے وہ اللہ کافی ہے جس نے اپنی تائید خاص اور مسلمانوں کے ذریعے سے تمھاری مدد فرمائی۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہوا ہے کہ اس نے اہل ایمان کے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا ہے ورنہ یہ کام تو دنیا جہان کی دولت بھی تم لٹا دیتے جب بھی ہونا ممکن نہیں تھا۔

(۶۳-۶۵) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دہانی کہ تم اپنے ساتھیوں کی افرادی قوت کی کمی سے کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہو، تمھارے لیے اللہ اور مومنین کی یہی مختصر سی جماعت کافی ہے۔ تم انھی مسلمانوں کو جہاد پر ابھارو۔ تمھارے بیس ثابت قدم جانباز کفار کے دو سو آدمیوں پر بھاری رہیں گے اور تمھارے سو مجاہد حریف کے ایک ہزار کے لشکر کو شکست دیں گے۔ جنگ، عزم و ایمان سے لڑی جاتی ہے۔ ان ناسمجھ کفار کے اندر یہ جوہر کہاں!

(۶۶) ایک آیت تخفیف جو بعد میں اس زمانہ میں نازل ہوئی جب لوگ اسلام کے اندر فوج در فوج داخل ہونے لگے۔ چونکہ ان مسلمانوں کے اندر وہ پختہ کاری نہیں تھی جو سابقون الاولون کے اندر تھی۔ اس وجہ سے وہ عددی نسبت گھٹا دی گئی جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی۔ اب نسبت صرف ایک اور دو کی رہ گئی، وضاحت آیت کی تفسیر کے تحت آئے گی۔

(۶۷-۶۹) کفار کے اس طعنہ کا جواب جو بدر میں شکست کھانے کے بعد انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کہ بھلا یہ پیغمبر کس طرح ہو سکتے ہیں، پیغمبر کا کہیں یہ کام ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہی قوم سے جنگ کرے، اس کا

خون بہائے، اس کے اندر سے قیدی پکڑے، ان سے فدیہ وصول کرے، اور قوم کے مال کو مالِ غنیمت قرار دے کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کرے اور کھائے کھلائے؟ اس طعنہ سے ان کا مقصود بدر میں مسلمانوں کی فتح کے ان اثرات کو مٹانا تھا جو قدرتی طور پر عام لوگوں کے دلوں پر پڑتے نظر آئے۔ چونکہ قریش کے لیڈروں نے خود اس جنگ کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنا دیا تھا، اس وجہ سے انھیں بدر میں منہ کی کھانے کے بعد اپنے پروپیگنڈے کا رخ بدل دینا پڑا۔ اب انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اقتدار اور حکومت کے خواہاں ہیں۔ اور اس مقصد کی خاطر انھوں نے اپنی ہی قوم کو آپس میں ٹکرا دیا ہے جو ایک پیغمبر کا کام کبھی نہیں ہوتا۔ قرآن نے ان کو یہ جواب دیا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے پیغمبر کی وجہ سے نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے باعث تم خود ہوئے ہو۔ دنیا کے طالب تم ہو، اللہ و رسول دنیا کے طالب نہیں ہیں۔ تم نے اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کی سازش کر کے جو اقدام کیا تھا وہ ایسا سنگین مجرمانہ اقدام تھا کہ حق تھا کہ تم پر خدا کی طرف سے عذاب عظیم آ جاتا جو تمہارا فیصلہ ہی کر دیتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے لیے جو مہلت لکھ رکھی ہے وہ تم کو ملی اور تم عذاب سے تباہ کر دیے جانے کے بجائے صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیے گئے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو خطاب کر کے ان کو اطمینان دلایا کہ یہ تمہارے مالِ غنیمت پر جو اعتراض کر رہے ہیں تم اس کی کوئی پروا نہ کرو۔ اس کو کھاؤ برتو، یہ تمہارے لیے حلال طیب ہے۔

(۷۰) اسی سلسلہ میں بدر کے قیدیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے یہ کہلوایا کہ اگر اللہ نے ان کے دلوں میں کوئی بھلائی پائی، انھوں نے اس احسان کی قدر کی کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تو ان کے لیے مزید بھلائی کی راہیں کھلیں گی۔ اور اگر انھوں نے بے وفائی اور بدعہدی کی اور پھر خدا سے لڑنے کے لیے نکلے تو یاد رکھیں کہ خدا ان پر پھر تم کو اسی طرح قابو دے دے گا جس طرح اس نے بدر میں ان کو تمہارے قابو میں دے دیا۔

(۷۱ - ۷۵) مہاجرین اور انصار کے درمیان اخوت کی تاسیس۔ اس اخوت میں وہ تمام مسلمان شریک ہیں جو کفر کے علاقوں سے ہجرت کر کے اس میں آ شامل ہوں۔ جو مسلمان ہجرت نہ کریں، دارالاسلام کے مسلمانوں پر ان کی نصرت و حمایت کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اگر اپنے دین و ایمان کے تحفظ کے لیے وہ کسی مدد کے طالب ہوں تو ان کی مدد کی جائے بشرطیکہ یہ مدد مسلمانوں کے کسی معاہد گروہ کے خلاف یا اس کے مقابل میں نہ ہو۔ اب حقوق و فرائض اور حمایت و نصرت کی ذمہ داری ایمان و ہجرت کی بنیاد پر ہو گی۔ پچھلے خاندانی اور قبائلی تعلقات کی بنیاد پر نہیں ہو گی۔ البتہ مسلمانوں کے آپس کے حقوق کی بنیاد انہی رحمی رشتوں کے تحت ہو گی جو اللہ کی کتاب میں بیان ہوئے ہیں۔

سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ (٨)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ٧٥

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

آيات ١-٨
يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (١) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ
وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى
رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (٢) الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
يُنْفِقُوْنَ (٣) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (٤) كَمَاۤ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ
بِالْحَقِّ ۪ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (٥) يُجَادِلُوْنَكَ
فِى الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ
يَنْظُرُوْنَ (٦) وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ
وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ
يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (٧) لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ

يُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ⑧

ترجمۂ آیات ۱-۸ وہ تم سے غنیمتوں کے بابت سوال کرتے ہیں، ان کو بتا دو کہ غنیمتیں اللہ اور رسول کے لیے ہیں، پس اللہ سے ڈرتے رہو، اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم سچے مومن ہو۔ مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کریں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھیں۔ جو نماز کا اہتمام کریں اور اس مال میں سے، جو ہم نے ان کو بخشا ہے، خرچ کریں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس درجے اور مغفرت اور باعزت روزی ہے۔ ۱-۴

اسی طرح کی بات اس وقت ظاہر ہوئی جب تمہارے رب نے ایک مقصد کے ساتھ تم کو گھر سے نکلنے کا حکم دیا اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو یہ بات ناگوار تھی۔ وہ تم سے امر حق میں جھگڑتے رہے باوجودیکہ حق ان پر اچھی طرح واضح تھا، معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور وہ اس کو دیکھ رہے ہیں۔ یاد کرو جب کہ اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمہارا لقمہ بنے گا اور تم یہ چاہ رہے تھے کہ غیر مسلح گروہ تمہارا لقمہ بنے اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے کلمات سے حق کا بول بالا کرے اور کافروں کی جڑ کاٹے تاکہ مجرموں کے علی الرغم وہ حق کو پایۂ اور باطل کو نابود کرے۔ ۵-۸

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ ؕ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَيۡنِكُمۡ ۖ وَاَطِيۡعُوا

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱)

لفظ انفال کی تحقیق

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ۔

انفال، نفل کی جمع ہے، اس کے معنی اضافہ اور زیادتی کے ہیں۔ جو چیز کسی کو اس کے حق سے زیادہ دی جائے تو جتنی حق سے زیادہ دی گئی وہ نفل ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے حق واجب سے زیادہ ادا کیا تو اس حصہ مزید کو نفل کہیں گے۔ یہاں انفال سے اس مالِ غنیمت کو تعبیر کیا گیا ہے جو راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کو مفتوح دشمن سے میدان جنگ میں حاصل ہوتا ہے۔ اس تعبیر میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے دشمن سے جو مال غنیمت حاصل کرتے ہیں اس کی حیثیت ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نفل مزید اور انعام مزید کی ہے اس لیے کہ جہاد کا جو اجر ہے وہ اس سے بالکل الگ مستقلاً اللہ کے ہاں دائمی اور بے پایاں اجر کی شکل میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

غنیمت سے متعلق سوال کی نوعیت

سوال، جیسا کہ ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، بعض اوقات اعتراض کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے، خواہ وہ الفاظ سے ظاہر ہو یا اس کے اندر مضمر ہو۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اسی نوعیت کے سوال کا حوالہ ہے۔ یہ سوال، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، غزوۂ بدر میں حاصل شدہ مال غنیمت سے متعلق ہے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کو کفار سے نہ تو کوئی منظم جنگ پیش آئی تھی نہ مال غنیمت اور اس کی تقسیم کا سوال پیدا ہوا تھا۔ ۲ھ میں یہ جنگ پیش آئی جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح بھی شاندار عطا فرمائی اور مالِ غنیمت بھی ان کو کافی مقدار میں حاصل ہوا۔ جاہلیت میں تو دستور یہ تھا کہ جو جتنا مال جنگ میں لوٹے وہ اس کا حقدار ہے۔ اسی دستور کی بنا پر بعض لوگوں نے، خاص طور پر کمزور قسم کے مسلمانوں نے ایسے سوالات اٹھائے جن سے یہ بات نمایاں ہوئی کہ تقویٰ، باہمی خیر خواہی، اطاعت اللہ و رسول کی وہ روح جو سچے ایمان کا تقاضا ہے ابھی ایک گروہ کے اندر اچھی طرح پختہ نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ سوال، جیسا کہ قرآن سے واضح ہے، کچھ خاص افراد ہی کی طرف سے اٹھایا گیا لیکن اسلامی معاشرہ کے اندر اس سے ایک بڑی خامی کی نشان دہی ہوئی تھی اس وجہ سے قرآن نے مسلمانوں کی تطہیر و تنظیم کی اس سورہ کا آغاز اسی واقعہ سے کیا کہ

سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ بیل   چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل

اور اس کا ذکر بھی عام صیغہ سے کیا تاکہ کسی خاص گروہ کی پردہ دری نہ ہو بلکہ تمام مسلمان بحیثیت مجموعی اس تعلیم کو قبول کریں اور اپنے اندر کسی ایسے رجحان کو نشو و نما نہ پانے دیں جو تقویٰ و توکل، باہمی ہمدردی اور اطاعت اللہ و رسول کے خلاف ہو۔

جس قسم کے سوال کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل تاریخ و سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ ابن ہشام میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے فارغ ہونے کے بعد حکم دیا کہ فوج

کے لوگوں نے جتنا مالِ غنیمت جمع کیا ہے سب اکٹھا کیا جائے چنانچہ وہ سب اکٹھا کیا گیا۔ اب لوگوں میں اختلاف ہوا کہ یہ کس کا حق ہے؟ جن لوگوں نے جمع کیا تھا وہ مدعی ہوئے کہ یہ ہمارا حق ہے، اگر ہم نہ ہوتے تو یہ مال حاصل نہ ہوتا، ہم نے دشمن کو مار بھگایا اس وجہ سے یہ ہاتھ لگا۔ اسی طرح جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر تھے انھوں نے کہا کہ ہم بھی سب کچھ کر سکتے تھے، لڑ بھی سکتے تھے، غنیمت بھی جمع کر سکتے تھے لیکن ہم نے رسول اللہ کی حفاظت کے کام کو دوسرے تمام کاموں پر مقدم رکھا اس وجہ سے مالِ غنیمت میں دوسرے لوگ ہم سے زیادہ حق دار نہیں ہو سکتے۔ غرض مختلف سوالات اٹھ کھڑے ہوئے جن سے لوگوں کے اندر دبی ہوئی بعض کمزوریاں سامنے آگئیں اور حکمتِ الٰہی مقتضی ہوئی کہ ان کمزوریوں کا بر موقع علاج ہو جائے تاکہ یہ مزید بڑھنے نہ پائیں۔

سوالات کا اصولی جواب

قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ۔ یہ ان تمام سوالات کا جامع اور اصولی جواب ہے کہ ان کو بتا دو کہ اموالِ غنیمت اللہ اور رسول کی ملک ہیں۔ 'اللہ و رسول کی ملک'، قرآن میں اجتماعی ملکیت کی تعبیر ہے۔ اس اصولی جواب نے اموالِ غنیمت کے باب میں اس جاہلی دستور کا خاتمہ کر دیا جو اب تک رہا تھا اور جس کی بنا پر ہی وہ سوالات پیدا ہوئے تھے جو اوپر مذکور ہوئے۔ گویا اموالِ غنیمت میں استحقاق کی بنیاد یہ نہیں ہو گی کہ کس نے جمع کیا، کس نے بالفعل جنگ کی، کس نے پہرہ دیا بلکہ اس میں سب مجاہدین، بلا لحاظ اس کے کہ کس کی خدمت کی نوعیت کیا رہی ہے، شریک ہوں گے اور دوسرے مسلمانوں کا بھی اس میں حصہ ہو گا۔ یہاں یہی اصولی جواب دے کر کلام کا رخ ان خامیوں کی اصلاح کی طرف مڑ گیا ہے جو اس واقعہ سے نمایاں ہوئی تھیں۔ پھر آگے چل کر آیت ۴۱ میں اس اجمال کی تفصیل بھی فرما دی کہ اس کا کتنا حصہ مجاہدین پر تقسیم ہو گا اور کتنا حصہ دوسرے مسلمانوں کے حق کی حیثیت سے بیت المال میں جمع ہو گا۔

مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کی بنیاد

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِکُمْ۔ جس طرح تقویٰ اور پاسِ رحم کو سورۂ نساء میں تمام خاندانی و معاشرتی صلاح و فلاح کی اساس ٹھہرایا ہے۔ اسی طرح یہاں تقویٰ اور اصلاحِ ذات البین کو مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اموالِ غنیمت اصلاً اللہ اور رسول کی ملکیت ہیں تو اللہ و رسول جس طرح ان کو تقسیم کریں پوری خوش دلی اور رضامندی سے اس تقسیم کو قبول کرو۔ نہ اللہ کے حکم سے متعلق دل میں کوئی بدگمانی یا رنجش پیدا ہو اور نہ اپنے دینی بھائیوں کے خلاف کوئی رشک و حسد کا جذبہ ابھرے کہ فلاں اور فلاں کو اس مال میں کیوں شریک بنا دیا گیا؟ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کے باہمی تعلقات کی بنیاد اخوت، رحم اور محبت پر ہے۔ یہ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کا گروہ ہے، ان کے اندر حسد، رقابت، خود غرضی اور نفسا نفسی کی حالت اس ایمان اور تقویٰ کے منافی ہے جس کو انھوں نے اختیار کیا ہے۔ جن کے اندر ابھی کوئی کانٹا اپنے دینی بھائیوں کے خلاف موجود ہے وہ اس کو نکال ڈالیں اور اپنے دامنِ دل کو ہر قسم کے غبار سے پاک و صاف کر لیں۔

ایمان باللہ کا لازمی تقاضا

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ یہ ایمان باللہ کا اصل تقاضا بیان ہوا کہ جو لوگ اللہ و رسول پر ایمان کے مدعی ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ اللہ و رسول کے ہر حکم کی اطاعت کریں۔ یہ بات ایمان کے منافی ہے کہ اللہ و رسول کا کوئی حکم اپنی خواہشات نفس کے خلاف ہو تو اس کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرے یا اس سے متعلق دل میں کوئی رنجش یا بدگمانی جگہ پائے۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ ایمان کی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جنھوں نے ایمان کی یہ حقیقت نہیں سمجھی ہے ان کا دعوائے ایمان بالکل بے حقیقت ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۚ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۚ (۲-۴)

سچے اہل ایمان کے اوصاف

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ .... اب یہ حقیقی ایمان اور سچے اہل ایمان کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں۔ گویا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کے الفاظ میں جن کمزور قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ تھا ان کے سامنے سچے اہل ایمان کی تصویر رکھ دی گئی کہ اگر ایمان کا دعویٰ ہے تو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرو۔ ان صفات کے بدوں یہ دعویٰ کسی کو زیب نہیں دیتا۔

ایمان کی پہلی علامت

اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ۔ ان کی پہلی علامت یہ بتائی کہ ان کے اندر خدا کی عظمت و کبریائی اور اس کی جلالت کا شعور ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ خدا سے برابر ڈرتے رہتے ہیں، جب ان کے سامنے خدا کا نام آجاتا ہے، جب ان کو اس کی یاد دہانی کی جاتی ہے، جب ان کے سامنے کوئی بات خدا کی بات کی حیثیت سے پیش کی جاتی ہے، وہ اس کو خوف و خشیت کے گہرے احساس کے ساتھ سنتے ہیں۔ گویا ایمان کا پہلا تقاضا خدا کا خوف ہے جو اس کی عظمت و جلالت اور اس کی صفات عدل و حکمت و ربوبیت و رحمت کے صحیح تصور سے پیدا ہوتا ہے اور اسی سے وہ تقویٰ وجود میں آتا ہے جس کی اوپر وَاتَّقُوا اللّٰهَ کے الفاظ سے ہدایت فرمائی گئی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خدا کی رحمت و ربوبیت بھی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، خدا کے عدل اور اس کے روز جزا کو مستلزم ہیں، اس وجہ سے ان صفات کا صحیح تصور بھی بندے کو خدا سے بے خوف نہیں بناتا بلکہ اس کے خوف کو بڑھاتا ہے اور اس خوف کی بنیاد خدا کی محبت پر ہوتی ہے۔

ایمان کی دوسری علامت

دوسری علامت یہ بتائی کہ جب اللہ کی آیات ان کو سنائی جاتی ہیں یہ ان کے ایمان کو بڑھاتی ہیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں آیات سے مراد خدا کے احکام اور اس کے قوانین ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا پر ایمان کے بعد ان کو سب سے زیادہ مرغوب و مطلوب خدا کی پسند و ناپسند اور اس کی مرضیات و احکام کا علم ہوتا ہے اور یہ علم ان کی دولت ایمان میں اضافہ کرتا ہے۔ ایمان کی مثال جڑ کی ہے اور آداب و احکام

اور قوانین و شرائع کی حیثیت اس جڑ سے پھوٹی ہوئی شاخوں اور ان سے ظہور میں آئے ہوئے برگ و بار کی۔ گویا پوری شریعت، ایمان ہی کا مظہر اور اسی کے مضمرات کی تفصیل ہوئی۔

'زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا' کے اسلوب بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن کے اندر ایمان موجود ہوتا ہے جب ان کے سامنے ایمان کے مقتضیات و مطالبات آتے ہیں تو وہ پوری بشاشت سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ ان مقتضیات و مطالبات کو اپنے ہی لگائے ہوئے درخت کا پھل اور اپنی ہی بوئی ہوئی کھیتی کا حاصل سمجھتے ہیں اور جس طرح ہر کسان اپنی کھیتی کے حاصل اور اپنے درخت کے پھلوں میں افزونی دیکھ کر باغ باغ ہوتا ہے اسی طرح یہ اہل ایمان بھی اپنے ایمان کی یہ افزائش دیکھ کر شاد مان ہوتے ہیں۔ یہ گویا ان مدعیانِ ایمان پر ایک لطیف تعریض ہوئی جو ایمان کا دعوے کرنے کو تو کر بیٹھے لیکن جب اس کے مطالبے سامنے آئے تو ان سے خوش ہونے کی بجائے ان کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے کہ یہ کیا بلا نازل ہو گئی۔

ایک نکتہ

یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ ایمان کے اقرار کے بعد اس کے مطالبات میں سے بڑا یا چھوٹا جو مطالبہ بھی اہل ایمان کے سامنے آتا ہے وہ ان کے لیے آزمائش و امتحان کا ایک میدان کھولتا ہے اور جو سچے اہل ایمان ہوتے ہیں وہ اس امتحان سے گھبرانے کی بجائے اس میں بازی جیتنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کوشش ان کی مومنانہ فطرت کا ایک فطری تقاضا ہوتی ہے۔ جس کے بروئے کار آنے سے ان کے لیے ہر امتحان فتح مندی کا ایک نیا دروازہ کھولتا ہے جس سے ان کا ایمان قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ احزاب میں یوں اشارہ فرمایا گیا ہے وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ۲۲۔ احزاب (اور جب مومنوں نے پارٹیوں کے ہجوم کو دیکھا تو بولے، یہ تو وہی صورت حال سامنے آئی ہے جس سے اللہ اور رسول نے پہلے ہی ہمیں خبردار کر دیا تھا، اور اس چیز نے ان کے ایمان و اطاعت میں اضافہ ہی کیا)

ایمان کی تیسری علامت

'وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ' یہ ان کی تیسری علامت بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے یعنی ایمان کے مطالبے، خواہ سخت ہوں یا نرم، ان سے دنیوی مفادات کو نقصان پہنچے یا نفع، ان کی خاطر تعلقات ٹوٹیں یا جڑیں وہ بہر حال دین و دنیا کی فلاح اپنے رب کے احکام کی تعمیل ہی میں سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایمان کی راہ میں انھیں اپنے سر بھی کٹوانے پڑ جاتے ہیں تو وہ یہی یقین رکھتے ہیں کہ حیاتِ جاوداں کے حصول کی راہ یہی ہے۔ ان کو اپنے رب پر پورا بھروسہ ہوتا ہے کہ اس نے جو حکم بھی ان کو دیا ہے اور جس آزمائش میں بھی ان کو ڈالا ہے اس میں سر تا سر انہی کی فلاح ہے۔ اپنے بندوں کے ساتھ خدا کا کوئی معاملہ بھی حکمت و مصلحت اور رحمت و برکت سے خالی نہیں۔ اس ٹکڑے میں بھی ان

خام کاروں پر تعریض ہے جو دین کے مطالبات کو اپنے مفادات کی میزان میں تولنے کے خواہش مند تھے اور وہ باتیں ان کو بالکل بے مصلحت نظر آتی تھیں جن کو وہ اپنی خواہشات کے خلاف پاتے تھے۔

ایمان کی چوتھی علامت

’اَلَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ‘ یہ چوتھی علامت بیان ہوئی اور اس کی حیثیت، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، رأس الصفات کی ہے اس لیے کہ انہی دو چیزوں۔ اہتمام نماز اور انفاق ۔۔ سے ان تمام اوصاف کی شیرازہ بندی ہوتی ہے جن سے ایمان اہل ایمان کو سنوارتا ہے۔
گویا اوپر ان چند خاص اوصاف کو بیان کرنے کے بعد جن کا بیان کرنا پیش نظر گروہ کی خامیوں کی اصلاح کے لیے ضروری ہوا، آخر میں ان دو چیزوں کا ذکر فرمایا جو سب کی جامع بھی ہیں اور سب کی محافظ بھی۔

’اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا‘ یعنی جن کے اندر یہ اوصاف ہیں سچے مومن وہی ہیں۔ رہے وہ لوگ، جو اہل ایمان کی صفوں میں آ تو گھسے ہیں لیکن ان اوصاف سے عاری ہیں، وہ محض مدعی ایمان ہیں، سچے مومن نہیں ہیں۔ گویا اوپر ’اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ‘ کے الفاظ میں جو بات اشارۃً فرمائی گئی تھی اب وہ پوری طرح واضح ہو کر سامنے آگئی۔

’لَہُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ وَمَغۡفِرَۃٌ وَّرِزۡقٌ کَرِیۡمٌ‘ مطلب یہ ہے کہ خدا کے ہاں جو درجے اور مرتبے ہیں وہ ہر مدعی ایمان کے لیے نہیں ہیں بلکہ انہی لوگوں کے لیے ہیں جو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سیاق میں ’مغفرۃ‘ کا لفظ بڑا بلیغ اور بشارت انگیز ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہر چند مطلوب و مطبوع تو یہی اوصاف ہیں اور مراتب انہی کے اعتبار سے قائم ہوں گے لیکن اللہ رحیم و کریم ہے، وہ اپنے بندوں کی کمزوریوں سے بھی واقف ہے اس وجہ سے ان غلطیوں اور کوتاہیوں کے لیے اس کی مغفرت کا دامن بھی ہے جو انسان کی بشریت کے لوازم میں سے ہیں۔

’رزق‘ کا لفظ، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں ایک جامع لفظ ہے اور کریم کی صفت اس کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اگرچہ بندوں کو سارا رزق و فضل رب کی عنایت ہی سے ملے گا لیکن اس کے ساتھ بندوں کے لیے عزت کی یہ سرفرازی بھی ہوگی کہ یہ سب کچھ ان کے حق کی حیثیت سے ان کو عطا ہوگا۔

ایمان کے گھٹنے اور بڑھنے کی نوعیت

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ایمان کوئی ٹھونٹھ درخت نہیں ہے بلکہ یہ جڑ بھی رکھتا ہے اور شاخیں اور برگ و بار بھی۔ قرآن میں اس کی تمثیل یوں بیان ہوئی ہے کہ ’اَصۡلُہَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُہَا فِی السَّمَآءِ‘ اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے جس کی جڑیں پاتال میں اتری ہوئی ہوں اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں۔ یہ جس طرح عقائد پر مبنی ہے اسی طرح احکام و شرائع پر بھی مشتمل ہے اور جس طرح ایک شاداب درخت اپنی جڑوں سے بھی غذا حاصل کرتا ہے اور اپنی شاخوں اور پتوں سے بھی، اسی طرح یہ عقائد کی معرفت اور اعمال کی بجا آوری دونوں سے غذا اور قوت

حاصل کرتا ہے۔ اگر عقائد میں کھوکھلا پن پیدا ہو جائے جب بھی یہ سوکھ جاتا ہے اور اگر اس کی شاخوں کو کوئی روگ لگ جائے جب بھی یہ مضمحل ہو جاتا ہے۔ اس کے صحیح نشو و نما کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جڑ اور اس کی شاخوں دونوں کی دیکھ بھال ہوتی رہے۔ اس دیکھ بھال سے یہ بڑھتا، پھیلتا اور پھلتا پھولتا ہے اور اس کے مفقود ہو جانے سے وہ گھٹتا، سکڑتا اور مردہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن و حدیث دونوں سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ ہمارے فقہاء اور متکلمین میں سے جن لوگوں نے ایمان کے گھٹنے بڑھنے سے انکار کیا ہے ان کی بات کا کوئی صحیح محمل اگر ہو سکتا ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو قانونی ایمان سے متعلق مانا جائے۔ قانون چونکہ صرف ظاہری حالات سے تعلق رکھتا ہے، باطن اس کی دسترس سے باہر ہے اس وجہ سے اس کی نظر میں ایک مخلص اور ایک منافق کے ایمان میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حقیقت کی نگاہ میں بھی دونوں کا ایمان یکساں ہے۔ یہاں اس اجمالی اشارے پر قناعت کیجیے۔ اس پر تفصیلی بحث اپنے محل میں آئے گی۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ
يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۭ وَ
اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّاۗىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ
لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۙ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۵-۸)

كَمَا کے مواقعِ استعمال

كَمَا، عربی زبان میں كَذٰلِكَ، كَاَيِّنْ اور كَمَا بسا اوقات واقعہ کی مماثلت واقعہ سے ظاہر کرنے کے لیے بھی آتے ہیں۔ ایسی صورت میں متعین الفاظ کے اندر ان کا مشبہ اور مشبہ بہ نہیں ہوتا بلکہ بحیثیت مجموعی واقعہ کے اندر ہوتا ہے۔ 'كَذٰلِكَ' بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں اسی نوعیت سے آیا ہے۔ امرأ القیس نے اپنے مشہور قصیدہ میں پہلے اپنی ایک سرگزشت عشق بیان کی اس کے بعد كَدَابِكَ مِنْ اُمِّ الْحُوَيْرِثِ قَبْلَهَا کہہ کر اپنی اسی طرح کی دوسری سرگزشتوں کا ذکر شروع کر دیا کہ اسی طرح کا ماجرا اس کو فلاں اور فلاں کے ساتھ بھی پیش آچکا ہے۔ بقرہ آیت ۱۵۱ سے اوپر تحویل قبلہ کا ذکر ہوا پھر بدون کسی تقریب و تمہید کے ارشاد ہوا كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یہ بھی اسی طرح کا اسلوب بیان ہے یعنی تمہارے قبلہ کو اہل کتاب کے قبلہ سے الگ کر کے خدا نے تم کو ایک علیحدہ امت کی حیثیت سے ممتاز کر دیا۔ اسی طرح کا 'كَمَا' یہ زیر بحث آیت میں بھی ہے۔ اوپر جیسا کہ مذکور ہوا، ان کمزور قسم کے مسلمانوں کے رویہ پر گرفت فرمائی ہے جو بدر میں حاصل شدہ مال غنیمت کی تقسیم پر معترض ہوئے تھے۔ جب ان کی یہ کمزوری زیر بحث آگئی تو تعلیم و تربیت کا تقاضا یہ ہوا کہ ان لوگوں کی ایک اور کمزوری کی طرف بھی توجہ دلا دی جائے جو اس سے پہلے ان سے اس وقت ظاہر ہوئی جب آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے بدر کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا ہے۔ گویا اس وقت تو ان کی غلطی نظر انداز فرمادی گئی کہ حکمت کا تقاضا یہی تھا لیکن جب اسی طرح کی غلطی ان سے پھر صادر ہوئی تو اس پر گرفت فرمائی گئی اور ساتھ ہی سابق غلطی کی طرف بھی اشارہ فرما دیا گیا کہ لوگ متنبہ ہو جائیں کہ یہ بیماری کہاں سے چلی ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوئی تو کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔

بدر کے لیے مسلمانوں کا نکلنا ایمائے الٰہی سے ہوا

'اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ' 'اَخْرَجَكَ رَبُّكَ' کے الفاظ اس امر پر نہایت واضح دلیل ہیں کہ بدر کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکلنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا تھا۔ آگے آیت ۴۳-۴۴ میں یہ اشارہ موجود ہے کہ آپ کو رویا میں شام کی طرف سے قافلۂ قریش کی واپسی اور مکہ کی طرف سے فوج قریش کی آمد کا مشاہدہ کرا دیا گیا تھا اور حملہ آور فوج کی حقیقت بھی واضح کر دی گئی تھی کہ معنوی اعتبار سے وہ کچھ زیادہ وزنی نہیں ہوگی بلکہ مسلمانوں سے مغلوب ہو جائے گی۔ بلکہ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسی رویا میں حضورؐ کو قریش کے خاص خاص لیڈروں کے قتل ہونے کی جگہیں بھی دکھا دی گئیں۔ اسی رویا کی ہدایت کے بموجب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اس وجہ سے اس کو 'اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آگے آیت ۴۲ سے یہ بات بھی واضح ہوگی کہ اسی خدائی رہنمائی کی برکت تھی کہ مسلمان بالکل ٹھیک اس وقت قریش کی فوج کے مقابلہ کے لیے بدر کے مقام پر پہنچ گئے جب کہ وادی کے ایک سرے پر ان کی فوج تھی اور نیچے سے قافلہ گزر رہا تھا۔

بدر کے لیے نکلنے کا اصل مقصد

'بِالْحَقِّ' یعنی اللہ تعالیٰ نے نکلنے کا یہ حکم ایک مقصد حق کے لیے دیا تھا۔ اس مقصد حق کی وضاحت آگے یوں فرمادی ہے يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (اللہ تعالیٰ اپنے حکموں سے یہ چاہتا ہے کہ حق کا بول بالا کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے) لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (تاکہ حق کا بول بالا کرے اور باطل کو نابود کرے مجرموں کے علی الرغم) اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکلنا ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ایک مقصد حق کے لیے تھا اور وہ مقصد حق یہ تھا کہ دین کا بول بالا ہو اور کفر کی جڑ کٹے۔ ظاہر ہے کہ کفر کی جڑ کٹ سکتی تھی تو قریش کی ہزیمت سے کٹ سکتی تھی نہ کہ ان کے کسی تجارتی قافلہ کو لوٹ لینے سے اس وجہ سے سیرت و مغازی کی کتابوں کی وہ روایت قرآن کے الفاظ کے صریحاً خلاف ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اس تجارتی قافلے پر حملہ کرنا چاہتے تھے جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آ رہا تھا۔

مسلمانوں کے اندر کے ایک کمزور گروہ کی طرف اشارہ

'وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ' 'فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ' سے کمزور قسم کے مسلمانوں کی وہ ٹولی مراد ہے جس کا کردار ابتدائے سورہ ہی سے زیر بحث ہے اور جس نے مال غنیمت سے متعلق بعد میں وہ سوالات بھی اٹھائے جن پر اوپر کی آیات میں تبصرہ ہوا ہے۔ 'فَرِيْقًا' کے لفظ سے یہ بات بھی نکلتی ہے

کہ ان لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی، بس ایک مختصر سی جماعت تھی۔ ان لوگوں نے جب یہ سنا ہوگا کہ کفار کی دو جماعتیں آرہی ہیں جن میں سے ایک سے مقابلہ درپیش ہے تو یہ بات تو وہ فوراً تاڑ گئے ہوں گے کہ یہ مقابلہ بہر حال فوج سے ہونا ہے نہ کہ تجارتی قافلہ سے اس وجہ سے ان لوگوں پر دہشت طاری ہوئی اور یہ دہشت ان کے اس ضعف اعتماد علی اللہ کا نتیجہ تھی جس کی طرف اوپر آیت ۲ میں اشارہ ہوا ہے۔

کمزوروں کی کمزوری پر گرفت

یُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ لفظ مُجَادلۃ کے معنی یہاں، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں اس کی تحقیق بیان کر چکے ہیں، باصرار و بلطائف الحیل مخاطب سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ اب یہ وضاحت ہو رہی ہے اس بات کی کہ جب ان کو خطرہ لاحق ہوگا کہ مقابلہ فوج سے درپیش ہے تو اس سے فرار کی انھوں نے کیا راہ نکالنی چاہی۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باصرار اور بلطائف الحیل اپنی چرب زبانی سے اس رُخ پر لانا چاہا کہ آپ تجارتی قافلے کا قصد کریں۔ بظاہر تو انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہوگی کہ یہ مشورہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی میں دے رہے ہیں کہ قافلہ کو لوٹ لینے سے قریش کی کمر اقتصادی اعتبار سے ٹوٹ جائے گی اس لیے کہ ان کے سرمایہ کا بڑا حصہ اس قافلے کے ساتھ ہے جس سے مسلمانوں کی موجودہ کمزور مالی حالت کو درست کرنے میں بڑی مدد ملے گی لیکن اس مشورہ کی تہ میں ان کا وہی خوف بیٹھا ہوا تھا جس کو قرآن نے بے نقاب کر دیا ہے کہ گویا وہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہوں اور وہ موت کو سامنے دیکھ رہے ہوں۔ اس مشورے کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ تھا کہ ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا، جیسا کہ قرآن کے الفاظ 'بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ' سے ثابت ہے، اچھی طرح واضح تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی بات منوانے کے لیے تمام حربے استعمال کیے۔ ہر چند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرحلے تک، جیسا کہ آگے والی آیت میں اشارہ آرہا ہے، بعض خاص اسباب سے، جن کی تفصیل آگے آئے گی، اپنا منشا واضح الفاظ میں ظاہر نہیں فرمایا تھا لیکن یہ لوگ اتنے غبی نہیں تھے کہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ جب ایک طرف تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف سے فوج آرہی ہے تو آنحضرتؐ کا یہ نکلنا کس سے نمٹنے کے لیے ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ دل کے بودے ضرور تھے لیکن عقل کے اتنے غریب نہیں تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج، اسلام کے مقصد، احقاقِ حق کے تقاضوں سے اتنے نابلد ہوں کہ یہ موٹی سی بات بھی نہ سمجھ سکیں کہ کسی تجارتی قافلہ کو تاخت و تاراج کرنا ایسا کیا کام ہو سکتا ہے جس کے لیے خدا کا رسول اپنے جاں نثاروں کے ساتھ یوں سربکف ہو کر نکلے! چنانچہ آگے تفصیل آئے گی کہ نہ مہاجرین کے لیڈروں کو آنحضرتؐ کا منشا سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا نہ انصار کے جاں نثاروں کو۔ سب نے پہلے ہی مرحلے میں تاڑ لیا کہ حضورؐ کا منشا کیا ہے اور اس منشا کی تکمیل کے لیے وہ سربکف ہو گئے۔ صرف ایک گروہ موت کے ڈر سے آخر وقت تک سخن سازی کرتا رہا اس وجہ سے اس کا رویہ قرآن میں زیر بحث آیا تاکہ آئندہ کے

مراحل میں مسلمان ان داخلی فتنوں سے ہوشیار رہیں۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ۔

جماعت کے حوصلہ کا اندازہ کرنے کے لیے ایک حکیمانہ طریقہ

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ کے اسلوب بیان میں جو ابہام ہے وہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکلتے وقت انصار و مہاجرین سے جب اس مہم کے باب میں استمزاج فرمایا تو بات کھل کر یوں نہیں فرمائی کہ تجارتی قافلہ کی حفاظت کا بہانہ بنا کر قریش نے ہم پر حملہ کرنے کے لیے اپنی فوج بھیج دی ہے بلکہ مبہم انداز میں یوں فرمایا کہ کفار کی دو جماعتیں آ رہی ہیں جن میں سے ایک کو اللہ تعالیٰ ہمارے قابو میں کر دے گا۔ یہ مبہم انداز بیان حضورؐ نے کیوں ارشاد فرمایا؟ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اہم مہم پر روانہ ہونے سے پہلے حضورؐ نے چاہا کہ ہر گروہ کا جائزہ لے لیا جائے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ اگر مسئلہ کو بالکل دو ٹوک انداز میں لوگوں کے سامنے رکھ دیتے تو مخلص و منافق سب کو آمنا وصدقنا کہتے ہی بن پڑتی۔ پھر نہ تو کسی کو اس سے اختلاف کی جرأت ہوتی اور نہ کسی کی کمزوری ظاہر ہو سکتی۔ یاد ہوگا، یہی طریقہ آپ نے جنگ احد کے موقع پر بھی اختیار فرمایا۔ اس وقت آپ نے لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ جنگ شہر سے باہر نکل کر کی جائے یا شہر میں محصور ہو کر اور خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرمائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جاں نثاروں نے شہر سے باہر نکل کر جنگ کرنے کی رائے دی اور کمزور قسم کے لوگوں نے شہر میں محصور ہو کر۔ اس طرح آپ کو جماعت کے قوی و ضعیف اور مخلص و منافق سب کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔[1] اسی حکمت و مصلحت سے حضورؐ نے اس موقع پر بھی بات مبہم انداز میں فرمائی کہ لوگوں کے جواب سے اندازہ ہو جائے کہ کون کس طرز پر سوچ رہا ہے چنانچہ پہلے آپ نے مہاجرین کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ وہ صاف سمجھ گئے کہ حضورؐ کا منشا کیا ہے۔ چنانچہ ان میں سے مقداد بن عمروؓ نے اٹھ کر ایک ایسی تقریر کی جس کی گونج اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ انھوں نے فرمایا:

> "اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ کو جس بات کا حکم دیا ہے آپ اس کے لیے اقدام کیجیے۔ آپ جہاں کے لیے نکلیں گے ہم آپ کے ہم رکاب ہیں۔ ہم آپ سے وہ بات کہنے والے نہیں ہیں جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہی تھی کہ تم اور تمھارا رب دونوں جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھتے ہیں بلکہ ہمارا قول یہ ہے کہ آپ اور آپ کا رب دونوں جنگ کے لیے نکلیں، جب تک کہ ایک آنکھ بھی ہم میں گردش کرتی ہے ہم سر کٹانے کے لیے حاضر ہیں۔"

کیا یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان الفاظ میں جن لوگوں کی ترجمانی کی گئی ہے ان کے کسی فرد میں بھی کسی

[1] اس مسئلہ پر تفصیلی بحث آل عمران کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

تجارتی قافلے پر حملے کا کوئی موہوم وسوسہ بھی ہو سکتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد اپنے وہی الفاظ جو اوپر مذکور ہوئے پھر دہرائے۔ انصار سمجھ گئے کہ اب حضورؐ ہمارا عندیہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انصار کے لیڈر سعد بن معاذ اٹھے اور انھوں نے عرض کیا کہ حضور کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ پھر انھوں نے وہ تقریر کی جس کا ایک ایک لفظ میدان جہاد کا رجز ہے اور جس کی حرارت ایمانی ۱۴سو سال گزرنے پر بھی ٹھنڈی نہیں پڑی ہے۔ انھوں نے فرمایا۔

"ہم آپ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپ کی تصدیق کی ہے، ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ جو دین آپ لے کر آئے ہیں وہی حق ہے۔ ہم نے آپ سے سمع و طاعت کا عہد و میثاق کیا ہے۔ پس اے اللہ کے رسول، آپ نے جو ارادہ فرمایا ہے وہ پورا کیجیے۔ اس خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہمیں اس سمندر کے کنارے لے جا کر اس میں کود پڑیں گے تو آپ کے ساتھ ہم بھی اس میں کود پڑیں گے اور ایک شخص بھی ہم میں سے پیچھے رہنے والا نہیں ہوگا۔ ہم اس بات سے نہیں گھبراتے کہ کل آپ ہمیں ہمارے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے لے جا کھڑا کریں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے۔ مقابلہ کے وقت ہم راست باز ثابت ہوں گے اور کیا عجب کہ اللہ ہمارے ہاتھوں وہ کچھ دکھائے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں تو اللہ کا نام لے کر آپ ہمیں ہمرکابی کا شرف بخشیے"

غور کیجیے کہ کیا یہ تقریریں ان لوگوں کی ہو سکتی ہیں جو ایک غیر مسلح قافلہ پر، جس کی جمعیت شاید کل چالیس آدمیوں پر منحصر تھی، حملہ کی سکیمیں سوچ رہے ہوں اور پھر اس امر پر غور کیجیے کہ کیا لفظ لفظ سے یہ بات واضح نہیں ہو رہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کے اس ابہام کے باوجود، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، انصار و مہاجرین دونوں گروہوں پر یہ بات سورج کی طرح روشن تھی کہ آپؐ کا منشا کیا ہے اور آپؐ کا رخ کدھر کو ہے۔ البتہ ایک گروہ، جیسا کہ قرآن کے الفاظ سے واضح ہے، ضعیف الایمانوں کا ایسا تھا جو حقیقت کی وضاحت کے باوجود محض اپنی بزدلی کے سبب سے یہ چاہتا تھا کہ حملہ قافلہ پر کیا جائے جو غیر مسلح ہے تاکہ خطرہ کوئی نہ پیش آئے اور لقمہ تر ہاتھ آئے۔ انہی کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ (تم چاہتے تھے کہ غیر مسلح گروہ تمہارا لقمہ بنے) 'شوک' اور 'شوکۃ' عربی میں کانٹے کو کہتے ہیں یہیں سے لفظ 'شوکۃ' ہتھیار اور پھر قوت اور دبدبہ کے معنی میں استعمال ہوا۔ چونکہ تجارتی قافلہ غیر مسلح تھا اس وجہ سے اس کے لیے 'غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ' کا لفظ استعمال ہوا۔

خدائی احکام کا منشا سمجھنے کے لیے ایک عقلی کسوٹی

'وَیُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ' اب یہ اللہ کے ارادے اور منشا کو سمجھنے اور جانچنے کے لیے ایک عقلی اور فطری معیار بتایا گیا ہے کہ اللہ کا ہر حکم دارادہ

احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے مقصد کے لیے ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی باتوں کا منشا، اگرچہ وہ مجمل ہوں، متعین کرنے میں اس اصول کو نظر انداز کرنا جائز نہیں ہے۔ جن لوگوں نے قافلہ پر حملہ کرنے کا ارمان کیا انھوں نے اس بات کا خیال نہ کیا کہ خدا ایک ایسی بات کیسے چاہ سکتا ہے جس سے نہ حق کا بول بالا ہو نہ کفر اور اہلِ کفر کی جڑ کٹے۔ 'کلمات' کا لفظ، جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں تصریح کر چکے ہیں، ایک قسم کے ابہام کا حامل ہے۔ چونکہ اس موقع پر بات، جیسا کہ ہم اوپر وضاحت کر چکے ہیں، لوگوں کے سامنے مبہم طور پر رکھی گئی تھی اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'کلمات' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ جن باتوں کے اندر کوئی اجمال و ابہام ہوتا ہے درحقیقت وہی باتیں ہوتی ہیں جن کے منشا کے تعین کا کام دشوار ہوتا ہے۔ ایسے مواقع میں اہلِ ایمان کی روش یہ ہونی چاہیے کہ بات کا وہ پہلو اختیار کریں جو اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی شان سے موافقت رکھنے والا ہو نہ کہ ان کے منافی۔ 'يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ' کے الفاظ سے قرآن نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ سارے کفر کی جڑ تو قریش کی جمعیت تھی، کاٹنے کی چیز تھی تو وہ تھی اور اللہ چاہ سکتا تھا تو اس کا کاٹنا چاہ سکتا تھا لیکن ایک گروہ نے تجارتی قافلہ ہی پر وار کر کے تیس مار خاں بننے کی کوشش کی۔

'لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ' یہ ٹکڑا 'يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ' کی غایت واضح کر رہا ہے کہ اللہ نے ان کافروں کی جڑ کاٹنے کا جو ارادہ فرمایا ہے تو اس کا مقصد حق کا بول بالا کرنا اور باطل کو مٹانا ہے۔ خدا کو کسی سے پرخاش نہیں ہے البتہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل اس کی صفات کا مقتضیٰ ہے اور اس کا فیصلہ اب خدا نے فرما لیا ہے اور یہ کام ہو کر رہے گا اور ان مجرموں کے علیٰ الرغم ہو کر رہے گا۔

قرآنی اشارات کی روشنی میں غزوۂ بدر کی اصل تصویر

اوپر قرآن نے جو اشارات کیے ہیں ان کی روشنی میں غزوہ بدر کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو سیرت و مغازی کی کتابوں میں پیش کی گئی ہے اور جس میں رنگ آمیزی کر کے مستشرقین نے اس کو اور زیادہ بھیانک شکل دے دی ہے۔

قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلمانوں کے ذہن میں قریش کے قافلۂ تجارت سے تعرض کرنے کا کوئی خیال موجود نہیں تھا۔ مدینہ پر حملہ کی ساری اسکیم قریش نے بنائی اور اس کے لیے قافلۂ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراشا۔ قریش مدینہ میں مسلمانوں کے جڑ پکڑنے سے بہت خائف تھے۔ مذہبی عناد کے علاوہ انہیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ اب مکہ اور شام کی تجارتی شاہراہ ان کے لیے محفوظ نہیں رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہی وہ اس فکر میں تھے کہ کوئی عذر تلاش کر کے مسلمانوں کو ایک قوت بننے سے پہلے ہی ختم کر دیں۔ اب یا تو قافلۂ تجارت کے سالار ابوسفیان نے واپسی کے موقع پر کوئی وہمی خطرہ مسلمانوں کے حملے کا محسوس کیا ہو کہ آدمی بھیج کر قریش کو حملہ کی خبر بھیج

دی یا اس کے لیے بھی پہلے سے قریش کے لیڈروں میں کوئی سازش رہی ہو۔ بہرحال ابوسفیان کی اطلاع پر مکہ سے ایک بھاری بھرکم لشکر مدینہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہ مرحلہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ردیا کے ذریعے سے یہ اطلاع ہوتی ہے کہ قریش کی دو جماعتیں آرہی ہیں جن میں سے ایک سے مسلمانوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد مدینہ سے بدر کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا اور مسلمانوں کے حوصلہ کا اندازہ کرنے کے لیے صورتِ حال مبہم انداز میں ان کے سامنے رکھی کہ کفار کی دو جماعتیں آرہی ہیں جن میں سے ایک سے ہمارا مقابلہ ہوگا۔ اور وہ ہم سے شکست کھائے گی۔ مسئلہ کے سامنے آتے ہی مہاجرین و انصار سب سمجھ گئے کہ قریش کی فوج آرہی ہے اور اس سے معاملہ درپیش ہے۔ چنانچہ ان کے لیڈروں نے پورے جوش وخروش کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفاداری اور اسلام کے لیے اپنی جاں نثاری کا یقین دلایا۔ البتہ ایک مختصر سی ٹولی ان میں ایسی بھی تھی جس نے اپنا زور اس بات کے لیے لگایا کہ قریش کی فوج کے بجائے قافلۂ تجارت کا رخ کیا جائے تاکہ بغیر ایک قطرۂ خون بہائے بھاری غنیمت ہاتھ آئے۔ اسی گروہ کو بے نقاب کرنے کے لیے حضورؐ نے اپنی بات مبہم انداز میں پیش کی تھی تاکہ جن لوگوں کے اندر کوئی کمزوری چھپی ہوئی ہے وہ اپنی کمزوری ظاہر کردیں اور مخلص و منافق میں مرحلۂ جنگ پیش آنے سے پہلے ہی امتیاز ہوجائے۔

آگے اسی سورہ کی بعض آیات کی روشنی میں ہم انشاء اللہ یہ بھی دکھائیں گے کہ اس جنگ کے لیے یہود نے بھی قریش کی پیٹھ ٹھونکی تھی لیکن میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ کر وہ اپنی عادت کے مطابق دبک گئے۔

۲۔ آگے کا مضمون —— آیات ۹ - ۱۹

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنی ان غیبی تائیدات کا حوالہ دیا ہے جو اس موقع پر مسلمانوں کی مدد اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ظاہر ہوئیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور اسلام کے مستقبل پر ان کا ایمان و اعتماد مضبوط ہو۔ اوپر کے ٹکڑے میں جن کمزور لوگوں کا ذکر آیا تھا ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کی جماعتی اصلاح ہی کے نقطۂ نظر سے آیا تھا، اب گویا اسی مقصد کے تحت ان باتوں کی یاد دہانی کی جارہی ہے جن کی یادداشت آگے کے مراحل میں کام آنے والی تھی۔ مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ کفارِ قریش کو بھی مخاطب کرکے تنبیہ کردی گئی کہ یہ چپت جو تمھیں لگی ہے یہ تو تمہید ہے، تمھاری روش اگر یہی رہی تو آگے اس سے سخت دنوں کا انتظار کرو، تم نے اس جنگ کے نتیجے کو حق و باطل کا معیار ٹھہرایا تھا تو اس کا نتیجہ تمھارے سامنے آگیا، اب بھی تمھاری آنکھیں نہ کھلیں، تم نے پھر

شرارت کی تو یاد رکھو ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں، کثرت تعداد و وسائل کا سارا گھمنڈ دھرا رہ جائے گا
اور تم پھر منہ کی کھاؤ گے، اہل ایمان کے پہلو پر ہم ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ آیات
الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ﴿٩﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ ٩-١٩
بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ ﴿١٠﴾ إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم ع ٢/١٠ ١٥
مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ
الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿١١﴾ إِذْ
يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ
سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ
الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿١٢﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا
اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَن يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١٣﴾ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ
النَّارِ ﴿١٤﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا
زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ﴿١٥﴾ وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ
دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ
بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٦﴾ فَلَمْ
تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ
اللَّهَ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ

سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٧﴾ ذٰلِكُمْ وَأَنَّ اللّٰهَ مُوهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِينَ ﴿١٨﴾
إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَإِنْ تَنْتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ
لَكُمْ ۚ وَإِنْ تَعُودُوا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا
وَلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٩﴾ ع ۹ ۱۶

ترجمہ آیات ۹ - ۱۹

اور یاد کرو جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمھاری فریاد سنی کہ میں ایک ہزار فرشتے تمھاری کمک پر بھیجنے والا ہوں جن کے پرے کے بعد پرے نمودار ہوں گے اور یہ صرف اس لیے کیا کہ تمھارے لیے خوش خبری ہو اور اس سے تمھارے دل مطمئن ہوں اور مدد تو خدا ہی کے پاس سے آتی ہے۔ بے شک اللہ عزیز و حکیم ہے۔ یاد کرو جب کہ وہ تم کو چین دینے کے لیے اپنی طرف سے تم پر نیند طاری کر دیتا ہے اور تم پر آسمان سے پانی برسا دیتا ہے تاکہ اس سے تم کو پاکیزگی بخشے اور تم سے شیطان کے وسوسے کو دفع کرے اور تاکہ اس سے تمھارے دلوں کو مضبوط کرے اور قدموں کو جمائے۔ یاد کرو جب تمھارا رب فرشتوں کو وحی کرتا ہے کہ میں تمھارے ساتھ ہوں تو تم ایمان والوں کو جمائے رکھو۔ میں کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا تو مارو ان کی گردنوں پر اور مارو ان کے پور پور پر۔ یہ اس سبب سے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ کو اٹھے ہیں اور جو اللہ و رسول کے مقابلہ کو اٹھتے ہیں تو اللہ ان کے لیے سخت پاداش والا ہے۔ سو یہ تو نقد چکھو اور کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔ ۹-۱۴

اے ایمان والو، جب تمھارا کفار سے مقابلہ ہو فوج کشی کی صورت میں تو ان

کو پیٹھ نہ دکھائے ہو اور جو ان کو اس وقت پیٹھ دکھائے گا، بجز اس کے کہ جنگ کے لیے پینترا بدلنا چاہتا ہو یا کسی جماعت کی طرف سمٹ رہا ہو، تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے۔ پس تم لوگوں نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور جب تو نے ان پر خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی کہ اللہ اپنی نشانیں دکھائے اور اپنی طرف سے اہل ایمان کے جوہر نمایاں کرے۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا سامنے ہے اور اللہ کافروں کے سارے داؤں بے کار کر کے رہے گا۔ اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو تمہارے سامنے فیصلہ آگیا اور اگر تم باز آجاؤ تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم پھر یہی کرو گے تو ہم بھی یہی کریں گے اور تمہاری جمعیت تمہارے کچھ کام نہ آئے گی خواہ کتنی ہی زیادہ ہو اور بے شک اللہ مومنین کے ساتھ ہے۔ ۱۵-۱۹

۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۹-۱۰)

غزوۂ بدر میں تائیدات الٰہی — اس سلسلہ کی پہلی تائید الٰہی

'أَنِّي مُمِدُّكُمْ' 'فَاسْتَجَابَ لَكُمْ' کی تفصیل ہے اور فاعل کا صیغہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کی قطعیت کے اظہار کے لیے ہے۔ 'إِرْدَاف' کے معنی 'توالی' یعنی یکے بعد دیگرے ظاہر ہونے کے ہیں۔ یہ اس سب سے پہلی تائید الٰہی کا بیان ہے جو اس موقع پر ظاہر ہوئی۔ مسلمانوں کی تعداد اس جنگ میں بہت تھوڑی تھی یعنی کل ۳۱۳ اور وہ بے سروسامان بھی تھے۔ ادھر کفار ایک ہزار کے قریب تھے اور ہر قسم کے اسلحہ سے لیس اور سروسامان سے بھرپور۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کو واحد سہارا خدا کی تائید ہی کا ہو سکتا تھا چنانچہ ایک ایک شخص سراپا عجز و نیاز اور یکسر دعا و فریاد بنا ہوا تھا۔ ان دعاؤں کی نوعیت

کا اندازہ کرنے کے لیے خود سرورِ عالم کی اس دعا کو پڑھ لینا کافی ہے جس کے الفاظ احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب نہتے مسلمانوں نے اپنے دل نکال کر اپنے رب کے سامنے رکھ دیے ہوں گے تو یہ دعائیں قبولیت سے کیسے محروم رہ سکتی تھیں۔ چنانچہ یہ قبول ہوئیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت نازل ہوئی کہ تم ہراساں نہ ہو، میں تمھاری کمک کے لیے ہزار فرشتے نازل کرنے والا ہوں، مطلب یہ کہ تم ہزار کافروں کی کیا پروا کرتے ہو، تمھارے جلو میں تو ہزار فرشتے ہوں گے۔ ان فرشتوں کے ظہور کی شکل یہ بتائی کہ ان کے دستے کے بعد دستے اور پرے کے بعد پرے نمایاں ہوں گے۔ میدانِ جنگ میں لڑنے والوں کی یہ سائیکالوجی ملحوظ رہے کہ جن کی حمایت میں کمک کے بعد کمک آ رہی ہو ان کا حوصلہ ہر کمک پر دونا ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے حریف کے اعصاب ڈھیلے پڑتے جاتے ہیں۔ یہ مضمون آلِ عمران کی آیات ۱۲۵-۱۲۶ میں بھی گزر چکا ہے۔ ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

اہل ایمان کے لیے ابدی بشارت

'وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ'۔ ضمیر مفعول کا مرجع وہی وعدۂ نصرت ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر تمھارے رب نے یہ صریح الفاظ میں تمھاری مدد کا پہلے سے جو وعدہ فرمایا تو محض اس لیے کہ تم ہراساں تھے، تمھاری ڈھارس بندھ جائے اور تمھارے دل مطمئن ہو جائیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا کہ خدا کی یہ مدد اسی موقع کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ جب بھی اللہ کے مومن بندے اس کی راہ میں جہاد کے لیے نکلیں گے اور ایمان و اخلاص کے ساتھ اس سے طالبِ مدد ہوں گے، وہ ان کی مدد فرمائے گا خواہ اس مدد کے لیے پہلے سے ان کو بشارت ملی ہو یا نہ ملی ہو۔ اس وضاحت کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ صریح الفاظ میں برسرِ موقع وعدۂ نصرت نبی کے ذریعہ ہی سے اور اس کی موجودگی ہی میں ہو سکتا ہے تو نبی کی غیر موجودگی میں یا اس کے زمانہ کے بعد کے لوگ کس طرح اطمینانِ قلب حاصل کر سکتے تھے۔ اس شبہ کے ازالے کے لیے یہ فرما دیا کہ یہ وعدہ اسی موقع کے لیے نہیں تھا بلکہ اہل ایمان کے لیے ابدی ہے۔

کم سوادوں کی بے بصیرتی

'وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ'۔ اس لیے کہ مدد تو جب بھی آتی ہے یا آئے گی اللہ ہی کے پاس سے آتی ہے یا آئے گی۔ پس خدا پر بھروسہ کرنے والے ہمیشہ خدا پر بھروسہ کریں، وہ ہمیشہ ان کی مدد فرمائے گا۔ خدا عزیز اور غالب ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اس کے ہاتھ پکڑ سکے لیکن ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اگر کبھی اہل ایمان کو کوئی افتاد پیش آ جاتی ہے تو اس میں بھی کوئی حکمت کارفرما اور اس کی تہ میں بھی بندوں ہی کی کوئی مصلحت مضمر ہوتی ہے۔ یہ مضمون سورۂ آلِ عمران میں احد کی شکست کے اسباب کے ذیل میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

اس زمانے کے بعض کم سوادوں نے اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا کہ فرشتوں کی فوج اتارنے کا وعدہ محض مسلمانوں کو ذرا ڈھارس دینے کے لیے تھا تاکہ وہ ہمت کر کے کفار سے بھڑ جائیں۔ ان کے

خیال میں قرآن نے جنگ کے بعد خود یہ راز کھول دیا کہ یہ بات محض تمھاری تسلی کے لیے کہہ دی گئی تھی، اس کی حقیقت کچھ نہیں تھی۔ گویا نعوذ باللہ پہلے تو اللہ میاں نے مسلمانوں کو حکم دیا اور پھر خود ہی اپنا بھانڈا پھوڑ دیا کہ اب کے تو ہم نے تم کو حکمہ دے کر لڑا دیا، آئندہ میرے بھرے میں نہ آنا، فرشتوں ورشتوں کی بات محض ایک بھڑ ہی تھی۔ شاید یہ حضرات اللہ میاں کو اپنے برابر بھی عقلمند نہیں سمجھتے۔

اِذۡ یُغَشِّیۡکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً مِّنۡہُ وَ یُنَزِّلُ عَلَیۡکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَہِّرَکُمۡ بِہٖ وَ یُذۡہِبَ عَنۡکُمۡ رِجۡزَ الشَّیۡطٰنِ وَ لِیَرۡبِطَ عَلٰی قُلُوۡبِکُمۡ وَ یُثَبِّتَ بِہِ الۡاَقۡدَامَ (۱۱)

'اِذۡ یُغَشِّیۡکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً مِّنۡہُ' یہ اس جنگ کے سلسلہ کی دوسری تائید الٰہی کا بیان ہے اور ذکر اس شب کا ہے جس کی صبح کو جنگ واقع ہوئی۔ تصویر حال کے مقصد سے صیغہ مضارع کا استعمال ہوا ہے جس کا استعمال تصویر حال کے لیے معروف ہے۔ فرمایا کہ یہ بات بھی خاص اللہ کی طرف سے ہوئی کہ شب میں اس نے تم پر نیند طاری کر دی کہ تمھارے اعصاب و دماغ کو سکون مل گیا اور تم صبح کو جنگ کے لیے چاق و چوبند ہو گئے۔ اس نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اس لیے کہ عین میدان جنگ میں ان لوگوں کا جن کی مٹھی بھر جماعت کو صبح ایک دل بادل فوج سے لڑنا ہے تھوڑا سا سو لینا بھی فی الواقع خدا کی تائید ہی کا مظہر ہے۔ نیند تو تھوڑی سی پریشانی سے بھی اچاٹ ہو جاتی ہے چہ جائیکہ ایک ایسی پریشانی میں جیسی کہ اس موقع پر مسلمانوں کو لاحق رہی ہوگی لیکن جن کو خدا کی طمانیت بخشیوں کی تھپکیاں حاصل ہوں وہ تختہ دار پر بھی سو سکتے ہیں۔ چنانچہ شب میں مسلمان سو لیے اور اس سے ان کے اعصاب اور دل و دماغ کو اتنا سکون حاصل ہو گیا کہ وہ جنگ کے لیے تازہ دم ہو گئے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۴ کے تحت ہم لکھ آئے ہیں کہ میدان جنگ میں فوج کے لیے سو لینے کا موقع مل جانا ہی اول تو بڑی نعمت ہے لیکن اس سے بڑی نعمت اس موقع سے صحیح فائدہ اٹھا سکنا ہے اس لیے کہ نیند کے لیے موقع مل جانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی انحصار دل و دماغ کی حالت پر ہے اور یہ چیز ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی، انہی ہی کو حاصل ہوتی ہے جن پر خدائے مقلب القلوب اپنے فضل خاص سے یہ سکینت طاری کر دے۔

اس سلسلہ کی دوسری تائید الٰہی نیند کے ذریعے تائید

عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ اونگھ کی یہ حالت مسلمانوں پر عین اس وقت طاری ہوئی جب زور و شور کا معرکہ گرم تھا اور حالت یہ ہوئی کہ لوگوں کے ہاتھوں سے تلواریں چھوٹ کر گری پڑتی تھیں۔ لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ اول تو یہی بات بڑی عجیب سی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی حالت کو اپنے انعام کے طور پر گنائے جس کا فائدہ سرتاسر کفار کے حق میں جاتا ہے۔ ان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا تائید ہو سکتی تھی کہ مسلمان عین لڑائی کے وقت اونگھنے لگ جائیں خواہ وہ کتنے ہی قلیل وقت کے لیے ہو۔ دوسرے یہ بات قرآن کے صریح الفاظ کے بھی بالکل خلاف ہے اس

ایک غلط فہمی کا ازالہ

طرح کی نیند کا ذکر قرآن میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک آلِ عمران آیت ۱۵۴ میں، دوسرے یہاں۔ آلِ عمران کے الفاظ یہ ہیں۔ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ (پھر اللہ نے تم پر غم کے بعد سکون اتارا یعنی نیند جس نے تم میں سے ایک گروہ کو ڈھانک لیا اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی رہی) اس آیت میں ظاہر ہے کہ غم سے وہی غم مراد ہے جو مسلمانوں کو احد کی شکست سے پیش آیا تو جب نیند کے اتارے جانے کا واقعہ اس غم کے پیش آنے کے بعد پیش آیا تو اس کا تعلق وقتِ جنگ سے کیسے ہو سکتا ہے، یہ تو لازماً جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد ہی کا واقعہ ہو سکتا ہے۔ اس نیند کے موقع اور اس کی اہمیت کی تفصیل ہم آلِ عمران کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

انفال کی زیرِ بحث آیت میں اس نیند کا ذکر ان تائیدات کے بیان کے ذیل میں ہوا ہے جو بالفعل جنگ شروع ہونے سے پہلے ظہور میں آئی ہیں۔ اس کے اوپر آپ نے دیکھا کہ فرشتوں کی فوج اتار جانے کی بشارت کا حوالہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بشارت جنگ سے پہلے دی گئی ہے۔ بعد کی آیت میں بارش کے نزول کا ذکر ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ یہ واقعہ بھی جنگ سے پہلے ہوا ہے۔ پھر ان دونوں کے بیچ میں ایک ایسی بات کیسے آ سکتی ہے جس کا تعلق معرکۂ کارزار سے ہو؟ قرآن نے اپنی ترتیبِ بیان ہی سے واقعہ کا موقع و محل نہایت خوبی سے واضح کر دیا ہے لیکن آفت یہ ہے کہ لوگ قرآن پر غور ہی نہیں کرتے۔

ممکن ہے یہاں کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ قرآن نے یہاں 'نُعَاس' کا لفظ استعمال کیا ہے جو عربی میں ابتدائی نیند یعنی اونگھ اور جھپکی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگر مقصود اطمینان کی نیند کا بیان کرنا ہوتا تو نوم یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ استعمال ہوتا۔ ہمارے نزدیک یہ شبہ کچھ وزن نہیں رکھتا۔ اول تو یہ خیال کیجیے کہ شدید پریشانی میں آدمی جس چیز سے محروم ہو جاتا ہے وہ ابتدائی نیند ہی ہے اور اگر کسی طرح آ جائے اور ذرا آنکھ لگ جائے تو آدمی کچھ سو ہی لیتا ہے۔ خدا نے اپنے فضلِ خاص سے یہ چیز مسلمانوں پر اڑھا دی، جیسا کہ 'يُغَشِّيْكُمْ' کے لفظ سے عیاں ہے اسی وجہ سے مسلمان سو لیے۔ دوسری بات یہ کہ سفر یا میدانِ جنگ میں گھوڑے بیچ کر اور مردوں سے شرط باندھ کر تو کوئی ذی ہوش بھی نہیں سوتا، جو بھی سوتا ہے وہ جھپکی والی نیند ہی سوتا ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک قرآن نے یہ لفظ نہایت برمحل اور بلیغ استعمال کیا ہے۔

اس سلسلہ کی تیسری تائیدِ الٰہی

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ

بارش کے ذریعے تائید

یہ تیسری تائیدِ الٰہی کا حوالہ ہے کہ عین موقع پر اللہ تعالیٰ تمھارے لیے آسمان سے پانی برسا دیتا ہے۔ یہاں 'مِنَ السَّمَآءِ' کے الفاظ بڑے بامعنی ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے پہلے

پہنچ کر پانی کے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے پانی کے باب میں مسلمانوں کو بڑی تشویش تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مِنَ السَّمَآءِ کے الفاظ سے گویا اپنے اس التفاتِ خاص کی طرف مسلمانوں کی توجہ دلائی کہ کفار نے جب تمھیں زمین کے پانی سے محروم کرنے کی تدبیر کی تو وہ تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ تمھارے رب نے تمھارے لیے آسمان سے پانی بھیج دیا۔

'لِّيُطَهِّرَكُمْ' میں پانی کا جو فائدہ بتایا ہے اس سے صحابہؓ کے ذوق و رجحان پر روشنی پڑتی ہے کہ ایمان و اسلام نے ان کے اقدار و پیمانے کس قدر بدل دیے تھے۔ پانی کا یہ فائدہ کہ پیا جاتا ہے ہر آدمی کو معلوم ہے بلکہ بیل اور گدھے بھی اس سے واقف ہیں۔ مومن کی نگاہ میں پانی کا اصلی فائدہ اور اس کی حقیقی قدر و قیمت اس بات میں ہے کہ وہ پاکیزگی اور طہارت کا ذریعہ اور شیطانی وسوسوں کے دور کرنے کا واسطہ ہے اور یہ چیز اللہ کو بہت محبوب ہے۔ صحابہؓ نے اس موقع پر پانی کے مسئلہ پر غور کیا ہو گا تو ان کے سامنے پینے کی ضرورت سے زیادہ اہمیت کے ساتھ یہ بات آئی ہو گی کہ وضو کیسے ہو گا، طہارت کے لیے کیا بنے گا، غسل کی ضرورت پیش آئی تو کیا صورت ہو گی؟ ان کی اس مخصوص پریشانی کی وجہ سے، جو ان کے جوشِ ایمان کا مظہر تھی، اللہ تعالیٰ نے پانی کی ان روحانی برکات کا خاص طور پر ذکر فرمایا اور اس کے عام حیوانی فوائد سے صرف نظر فرمایا کہ وہ تو سبھی کے علم میں ہیں۔

رِجْزَ الشَّيْطٰنِ سے مراد شیطانی وساوس ہیں۔ اس کے ذکر کا بھی ایک خاص محل ہے۔ آدمی جب ناپاکی کی حالت میں ہو تو جس طرح گندی چیزوں پر مکھیوں کا زیادہ ہجوم ہوتا ہے، اسی طرح گندگی کی حالت میں شیطانی وساوس کا بھی آدمی پر زیادہ غلبہ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بعض احادیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔ علاوہ بریں یہ بات بھی ہے کہ اگر پانی جیسی ناگزیر شے کی نایابی کا سوال پیدا ہو جائے اور وہ بھی عینِ جنگ کی حالت میں تو شیطان اس کی آڑ میں ایسی بد دلی اور مایوسی پھیلا سکتا ہے کہ بہتوں کا ایمان متزلزل ہو جائے۔

رجز الشیطن سے مراد

وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱) ربط اللہ علی قلبہ: قوّاہ و صبّرہ خدا نے اس کے دل کو مضبوط کر دیا، اس کو ثباتِ قلب بخشا، اس کو تھام لیا۔ عام طور پر لوگوں نے اس ثباتِ قلب اور ثباتِ قدم کو بھی مذکورہ بارش ہی کے تحت شمار کیا اور اس پہلو سے اس ٹکڑے کی تاویل کی ہے لیکن میرا رجحان یہ ہے کہ یہ اس نیند کے فوائد کی تفصیل ہے جس کا اوپر ذکر ہے۔ میرے رجحان کے وجوہ حسبِ ذیل ہیں۔

نیند کے فوائد کی تفصیل

اول یہ کہ 'لِيَرْبِطَ' میں 'ل' کا اعادہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ بعینہٖ لِيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ کے تحت نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو بغیر اعادہ 'ل' کے آتا جس طرح 'وَيُذْهِبَ' ہے۔ فصیح عربی میں اسلوب بیان یہی ہے۔ کلامِ عرب اور قرآن کے نظائر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کتاب

میں اس کی ایک سے زیادہ مثالیں گزر چکی ہیں۔ بقرہ میں ہے۔ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۸۵- بقرہ)

(اور اللہ تمھارے لیے سہولت چاہتا ہے، تنگی نہیں چاہتا اور تاکہ تم تعداد پوری کرو اور تاکہ تم اس ہدایت پر جو اس نے تم کو بخشی ہے اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم شکر گزار رہو) ہم نے اس آیت کے تحت وضاحت کی ہے کہ یہ اوپر کے بیان کردہ احکام کی الگ الگ علتیں واضح کی گئی ہیں، اس وجہ سے ہر ایک کے ساتھ لؔ کا اعادہ کیا گیا اور ترتیب بیان نزولی نہیں بلکہ صعودی ہے یعنی نیچے سے اوپر کو چڑھتے ہوئے ایک ایک حکم کی غایت واضح کی گئی ہے۔ بالکل اسی اصول پر یہاں بھی ترتیب صعودی ہے۔ پانی کا ذکر سب سے آخر میں ہے، پہلے اس کا فائدہ بیان کیا گیا ہے۔ پھر نیند کا فائدہ بیان ہوا جس کا ذکر اوپر تھا اور لِؔ کا اعادہ کرکے یہ اشارہ فرما دیا کہ اس کا تعلق قریبی شے سے نہیں ہے بلکہ دوسری چیز سے ہے

دوم یہ کہ ثباتِ قلب، سکون دماغ اور ثبات قدم کا واضح تعلق نیند ہی سے ہے اسی وجہ سے قرآن نے اس کو ’امنۃ‘ سے تعبیر فرمایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر رات، بے خوابی اور پریشانی میں گزری ہو تو دماغ اڑا اڑا پھرتا ہے، دل پراگندہ اور پریشان رہتا ہے۔ آدمی قدم رکھتا کہیں ہے، پڑتے کہیں ہیں۔ ایسی ذہنی اور قلبی پریشانی میں آدمی کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی سلیقہ سے نہیں کر پاتا چہ جائیکہ دشمن سے مقابلہ اور وہ بھی اس دور کی جنگ میں جس میں کامیابی کا انحصار مشینوں کی قوت پر نہیں بلکہ لڑنے والوں کے اپنے اعصاب کی چستی اور قوت پر تھا۔ یہ بات بھی یہاں ملحوظ رہے کہ متعدد عرب شعرا نے اپنے جنگی کارناموں کی تفصیل کرتے ہوئے یہ بات بیان کی ہے کہ ہم نے رات میں اپنے دشمن کو سونے نہیں دیا جس کے سبب سے صبح کو ان کے دل ایسے اکھڑے ہوئے تھے کہ ہمارے سامنے ان کے قدم نہ جم سکے۔

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ (۱۲-۱۴)

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ، یہاں ملائکہ سے مراد ملائکہ کی وہی فوج ہے جس کی اوپر بشارت دی گئی۔ یہ فوج براہ راست، رب الافواج کی کمان میں تھی اس وجہ سے اس کو احکام بھی براہ راست اسی کی طرف سے ملتے تھے اور ان احکام کا ذریعہ وحی الٰہی تھی اس لیے کہ فرشتے بھی با ایں علو مرتبت خدا تک براہ راست رسائی نہیں رکھتے۔

خدا کی شان ابتلا کے پردے سے ظاہر ہوئی

’اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا‘ یہ پہلا حکم ہے جو اس فوج کو ملا۔ ارشاد ہوا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں تو تم مسلمانوں کو ثابت قدم رکھو۔ اس سے ایک بات تو یہ نکلی کہ خدا کی معیت کے بغیر فرشتے

بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسری یہ کہ فرشتوں کا کام بھی بہر حال یہ نہیں تھا کہ وہ مسلمانوں سے یہ کہہ دیں کہ تم الگ ہو کر بیٹھو، ہم لڑ کر تمھارے لیے میدان جیتے دیتے ہیں بلکہ ان کا فریضۂ منصبی مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنا تھا۔ گویا اصلی چیز مسلمانوں کی خود اپنی شجاعت اور ثابت قدمی تھی۔ مسلمان اپنا یہ جوہر دکھائیں تو خدا کی امداد ان کے ساتھ ہے۔ سنت الٰہی یہی ہے کہ خدا کے ہاتھ ہمیشہ اسباب کے اوٹ سے کام کرتے ہیں۔

اصل طاقت حوصلہ ہے

'سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ' مطلب یہ کہ اہل ایمان اپنی ثابت قدمی کا ثبوت دے دیں پھر زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ میں کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دوں گا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ فوج کی اصلی قوت اس کے حوصلہ (MORALE) میں ہوتی ہے۔ اگر حوصلہ بحال رہے تو سپاہی بے تیغ و تفنگ بھی لڑتا ہے اور اگر حوصلہ ٹوٹ جائے تو اسلحہ کے بڑے بڑے ذخیرے غنیم کے لیے چھوڑ کر فوج بھاگ کھڑی ہوتی ہے تو یہ جو فرمایا کہ میں ان کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہوئی بلکہ یہ تعبیر ہوئی ان کی کمر توڑ دینے کی۔

'فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ' یہ ان کی مرعوبیت کے نتیجہ کی نہایت حقیقت افروز تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب ان کا حوصلہ ٹوٹ جائے گا تو ان کو بھیڑوں بکریوں بلکہ گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال دو۔ ان کی گردنوں کے اوپر مارو، ان کے ایک ایک پور پر مارو، یہ تصویر ہے مرعوبیت کے باعث ان کی بے بسی کی۔ حریف میں جب تک دم خم ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اس بات کا موقع وہ مشکل ہی سے دیتا ہے کہ آپ جہاں چاہیں اس کے ماردیں لیکن جب اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تو پکڑ کر اس کی چندیا پر جوتے لگا دیجیے۔ وہ چوں بھی نہ کر سکے گا۔ تعیین محل کے ساتھ جب کسی کو مارنے کے لیے کہا جائے تو اس میں اس کی تحقیر و تذلیل بھی مدنظر ہوتی ہے اور اس سے اس کی بے بسی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ

یہ وجہ بیان ہوئی اس بات کی کہ کیوں خدا ان کے دلوں میں رعب ڈالے ہوئے گا اور کیوں یہ مسلمانوں کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح کاٹے جائیں گے؟ فرمایا کہ اس لیے کہ یہ اللہ و رسول کے مقابلہ کے لیے اٹھے ہیں اور جو لوگ اللہ و رسول سے مقابلہ کے لیے اٹھتے ہیں اللہ ان کو شدید پاداش سے دوچار کرتا ہے۔ انسانی فطرت کے اندر خدا اور خدا کے رسول سے لڑنے کے لیے کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ لڑائی کا جواز وہاں ہوتا ہے جہاں کسی حق کی حفاظت مدنظر ہو اور اسی صورت میں لڑائی کا حوصلہ بھی ابھرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے مقابل میں کسی حق کا سوال پیدا نہیں ہوتا اس وجہ سے اس قسم کی جہالت کے لیے جو لوگ اٹھتے ہیں وہ اٹھیں چاہے طوفان کی طرح لیکن مقابلہ پیش آجائے تو بیٹھ جاتے ہیں بلبلے کی طرح۔ اس لیے کہ ان کے حوصلہ کی بنیاد کسی حق پر نہیں ہوتی۔

'ذٰلِکُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابَ النَّارِ' اور خطاب مسلمانوں سے تھا، یہ اثنائے کلام میں ایک بات قریش کو مخاطب کر کے فرما دی کہ یہ جو کچھ بدر میں تمہارے سامنے پیش آیا ہے یہ نقد عاجل ہے اس کو چکھو اور دوزخ کے عذاب کا انتظار کرو۔ یہ گویا 'اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ' کی وضاحت ہوئی کہ خدا کی طرف سے جو پاداش تمہارے لیے مقرر ہے اس کو اسی پر ختم نہ سمجھو، اصل پاداش کی جگہ دوزخ ہے۔ اس کا انتظار کرو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ (۱۵-۱۶)

'زحف' کا مفہوم

'اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا' زحف کے اصل معنی گھسل گھسل کر یا گھٹنوں پر چلنے کے ہیں یہیں سے یہ کسی بھاری بھرکم، سازوسامان سے لدے پھندے لشکر کے جنگ کے لیے نکلنے کے معنی میں استعمال ہوا اس لیے کہ وہ بھی آہستہ آہستہ ہی مارچ کرتا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ لفظ کا یہ استعمال اس مشینی دور کا نہیں بلکہ اس دور کا ہے جب فوج کی نقل و حرکت گھوڑوں، گدھوں اور اونٹ وغیرہ کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔

عرب میں جنگ کے دو معروف طریقے

عرب میں جنگ کے دو طریقے معروف تھے۔ ایک منظم فوج کشی کا، دوسرا وہ جس کو اس زمانے میں گوریلا وار فیر کہتے تھے۔ گوریلا وار فیر کا اصول یہ تھا کہ حملہ کرو، لوٹو اور بھاگ جاؤ۔ اس کو کہتے بھی کرّ و فرّ کی جنگ تھے۔ اس کے لیے چھوٹے چھوٹے دستے نکلتے اور چھاپہ مار کر اپنی جا پناہوں میں چھپ جاتے تھے۔ اس کا کوئی مخصوص ضابطہ نہیں تھا بس جس طرح کامیاب چھاپہ مارا جا سکے اور اپنے کو بچایا جا سکے وہی اس کا اصلی ہنر تھا۔

منظم فوج کشی کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے لیے ایک ضابطہ تھا جس کی پابندی اہل لشکر کو بھی کرنی پڑتی تھی اور فریقین جنگ بھی، جو آپس میں لڑتے تھے، اس کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ یہاں آیت میں زیر بحث وہی منظم فوج کشی والی صورت ہے چنانچہ اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے 'زَحْفًا' کا لفظ استعمال ہوا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس حکم کا تعلق گوریلا وار فیر کی صورت سے نہیں ہے۔

آئندہ کی جنگوں سے متعلق ضروری ہدایت

اب یہ مسلمانوں کو آئندہ پیش آنے والی جنگوں سے متعلق ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب منظم فوج کشی کی شکل میں دشمن سے تمہارا مقابلہ ہو تو پیٹھ نہ دکھانا۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی انہی تائیدات پر مبنی ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہیں کہ جن کی پشت پر خدا اور اس کے فرشتے یوں مدد و نصرت کے لیے کھڑے ہوں ان کے لیے حرام ہے کہ وہ اپنی پیٹھ دشمن کو دکھائیں۔

جنگ میں پیٹھ دکھانے کا جرم

'وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗۤ' الایۃ ایسی صورت میں جو لوگ دشمن کو پیٹھ دکھائیں گے فرمایا کہ وہ خدا کا غضب لے کر لوٹیں گے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جرم کفر و ارتداد کے

برابر ہے۔ اس جرم کی یہ شدت ظاہر ہے کہ اسی بنیاد پر ہے کہ جو شخص میدانِ جنگ سے بھاگتا ہے وہ اپنی اس بزدلی سے بسا اوقات پوری فوج بلکہ پوری ملت کے لیے ایک شدید خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔

'اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ' یعنی اس سے مستثنیٰ وہ شکلیں ہیں جو کوئی سپاہی کسی جنگی تدبیر کے لیے اختیار کرتا ہے یا کوئی ایسی صورت اس کے سامنے آگئی ہے کہ وہ اپنے ایک مورچے سے ہٹ کر اپنے ہی کسی دوسرے مورچے کی طرف سمٹنا چاہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حرام جو چیز ہے وہ فرار کی نوعیت کا پیٹھ دکھانا ہے، وہ پیچھے ہٹنا اس سے مستثنیٰ ہے جو تدبیرِ جنگ کی نوعیت کا ہو۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۷-۱۸)

پیغمبر صلعم کی آستین سے دستِ غیب کے کارنامے

'فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ' میں خطاب عام مسلمانوں سے ہے اور 'وَمَا رَمَيْتَ' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اس وجہ سے دونوں میں جمع اور واحد کا فرق ہے۔ 'رمی' تیر مارنے، کنکر پتھر پھینکنے، خاک اور راکھ جھونکنے، سبھی کے لیے آتا ہے۔ روایات میں ہے کہ جب کفار کی فوجیں سامنے ہوئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر خاک زمین سے اٹھائی اور 'شاهت الوجوه' کہہ کر کفار کی طرف پھینکی۔ 'شاهت الوجوه' عربی میں لعنت کا فقرہ ہے اور کسی کے اوپر خاک جھونکنا نہایت قدیم زمانہ سے لعنت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ تورات میں بھی اس کا ذکر آتا ہے اور عرب کی روایات سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ سورۂ فیل کی تفسیر میں مولانا فراہیؒ نے اس کے حوالے دیے ہیں۔

یہاں زبان کا یہ اسلوب بھی نگاہ میں رہے کہ بعض مرتبہ فعل کی نفی سے مقصود نفسِ فعل کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اس فعل کے ساتھ ان شاندار نتائج کی نسبت کی نفی ہوتی ہے جو اس فعل کے پردے میں ظاہر ہوئے۔ مٹھی بھر نہتے مسلمانوں کا قریش کی دل بادل غرق آہن فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال دینا یا آنحضرتؐ کے دستِ مبارک سے پھینکی ہوئی چٹکی بھر خاک کا ایک ایسا طوفان بن جانا کہ تمام کفار کو اپنی اپنی آنکھوں کی پڑ جائے، یہ مسلمانوں کی چھتریوں میں لٹکی ہوئی تلواروں یا پیغمبر کی رمی کے کارنامے نہیں تھے بلکہ اس دستِ غیب کے کارنامے تھے جو مسلمانوں کی میانوں اور پیغمبرِ عالمؐ کی آستینوں میں چھپا ہوا تھا۔

'اَبْلٰى فُلَانٌ فِى الْحَرْبِ بَلَآءً حَسَنًا' کے معنی ہوں گے کہ اس نے میدانِ جنگ میں خوب خوب اپنی بہادری کے جوہر دکھائے یہاں تک کہ سب نے اس کا لوہا مان لیا۔ 'اَبْلَى اللّٰهُ عِبَادَهٗ بَلَآءً حَسَنًا' کے معنی ہوں گے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے اچھے جوہر نمایاں کیے۔ 'وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ' کا معطوف علیہ یہاں عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق محذوف ہے۔ اس لیے کہ اوپر کے الفاظ سے وہ خود بخود واضح ہے۔ اس محذوف کو کھول دیجیے تو گویا پوری بات یوں ہوگی "تاکہ اللہ اپنی نصرت کی شانیں دکھائے اور مسلمانوں کے جوہر اچھی

طرح نمایاں کر دے۔

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ کی صفات سمع و علم کے حوالے سے یہاں مقصود مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا ہے کہ خدا کسی بات سے بھی بے خبر نہیں رہ وہ اپنے بندوں کی دعائیں اور فریادیں ہر وقت سنتا اور ان کی ضرورتیں اور حاجتیں ہر لحظہ جانتا ہے۔ بدر میں اس کی تائیدات کا بروقت ظہور اس کی تازہ شہادت ہے۔

ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ذٰلِکُمْ جب اس طرح آتا ہے تو یہ پورے جملے کا قائم مقام ہوتا ہے اور اس کے بعد جو حرفِ ربط آتا ہے اس کا تعلق اس مخفی مضمون سے ہوتا ہے جو اس کے اندر مضمر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا کی تائید و نصرت کی یہ نشانیں جو ظاہر ہوئیں یہ تمھارے لیے نقد ہیں اور مزید براں یہ ہے کہ خدا کفار کی ساری چالیں جو وہ تمھارے خلاف چلیں گے بودی ثابت کرتا رہے گا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ جملہ ٹھیک ٹھیک اوپر کے جملہ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ کا مد مقابل جملہ ہے یعنی کفار کے لیے یہ چپت نقد ہے جو ان کو بدر میں لگی اور تمھارے لیے یہ فتح عظیم نقد ہے جو تمھیں حاصل ہوئی اب آگے ان کے لیے دوزخ ہے اور تمھارے لیے یہ بشارت کہ کفار کی سازشوں کے تمام تار و پود بکھر جائیں گے اور دینِ حق کا بول بالا ہوگا۔

جنگِ بدر کفار کی ایک سازش تھی

'كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ' کے الفاظ سے وہ بات صاف نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے پیچھے اشارہ کیا ہے کہ یہ جنگ قریش کے لیڈروں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے قافلۂ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراش کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ آگے آیت ۴۲ کے تحت واضح ہوگا، بروقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سازش سے باخبر کر دیا اور مسلمان مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'کید' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی چال اور سازش کے ہیں۔ آگے آیت ۴۸ سے انشاء اللہ یہ بات بھی ثابت ہو جائے گی کہ اس سازش میں یہود بھی شریک تھے۔

اجزا کی وضاحت کے بعد آیت کے سیاق و سباق پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اوپر کی آیات میں مسلمانوں کو جس جان بازی و سرفروشی کی دعوت دی گئی ہے یہ اسی کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ تم کیوں جان چراؤ اور کیوں پیٹھ دکھاؤ جب کہ تم نہیں لڑتے بلکہ تمھاری طرف سے خدا لڑتا ہے۔ لڑتا در اصل خدا ہے البتہ وہ تمھارے لیے میدان فراہم کرتا ہے کہ تمھارے جوہر نمایاں ہوں اور تم دین و دنیا دونوں کی سرفرازی حاصل کرو۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ
وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۹)

جنگِ بدر فیصلہ کی میزان

اس آیت میں براہ راست قریش کو مخاطب کر لیا گیا ہے کہ بولو، اب کیا کہتے ہو؟ تم ہی تو کہتے تھے کہ اس جنگ میں جو جیتا وہ حق پر سمجھا جائے گا تو فتح تو تمھارے سامنے آ گئی۔ یہ بات بھی یہاں ملحوظ رہے کہ قریش کے لیڈروں نے اپنی کثرتِ تعداد کے نشہ میں اس موقع پر خوب بڑھ بڑھ کے تقریریں کیں۔ چونکہ

ان کو اپنی فتح کا سو فی صدی یقین تھا اس وجہ سے انھوں نے اس جنگ کو فیصلہ کی میزان ٹھہرا لیا کہ یہ میزان جو فیصلہ کر دے گی وہ اس کو بے چون و چرا تسلیم کر لیں گے۔ ابوجہل اس جنگ کے برپا کرنے میں سب سے زیادہ سرگرم تھا۔ اس کی یہ دعا کتابوں میں مذکور ہے کہ اللهم اقطعنا للرحم فاحنه الغداة (اے اللہ فریقین میں سے جو سب سے زیادہ قطع رحم کا مجرم ہوا ہے تو کل اس کو کچل دیجیو) قرآن نے قریش کی انھی لن ترانیوں کو سامنے رکھ کر کہا کہ اگر اس جنگ کی فتح پر فیصلہ کا انحصار تھا تو اس قاضی کا فیصلہ تو صادر ہو گیا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ غزوۂ بدر کی اسی خاص نوعیت کی بنا پر قرآن نے اس کو یوم الفرقان سے تعبیر فرمایا ہے یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والی جنگ۔ آگے آیت ۳۲ کے تحت یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ قریش علانیہ بڑی ڈھٹائی سے یہ کہتے تھے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت حق ہے تو خدا ہم پر پتھر برسا دے یا کوئی اور عذاب ہم پر آجائے تب ہم مان لیں گے۔

نصیحت لو، فضیحت نہ ہو

'وَإِنْ تَنْتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ' میں نصیحت بھی ہے، فضیحت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ بہتر ہے کہ اس سے سبق لو اور اگر سبق نہ لیا تو یاد رکھو کہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑو گے اپنی ہی شامت بلاؤ گے۔ 'وَإِنْ تَعُودُوا نَعُدْ' میں کھلی ہوئی دھمکی ہے کہ اگر تم نے اس قسم کی شرارت پھر کی تو یاد رکھو کہ ہم کہیں چلے نہیں جائیں گے، تمھارا سر کچلنے کے لیے اسی طرح ہم پھر آموجود ہوں گے 'وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ' اور تمھاری جمعیت تمھارے کچھ کام نہ آسکے گی، خواہ کتنی ہی زیادہ ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ واحد چیز جو تم سوچ سکتے ہو یہی ہے کہ آیندہ مزید قوت و شوکت کے ساتھ حملہ کرو، سو یہ چیز بھی تمھارے کچھ کام آنے والی نہیں۔ بس یہ ہوگا کہ ہماری بھٹی کے لیے کچھ اور ایندھن فراہم کر کے لاؤ گے۔ 'وَأَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ' یہ ٹکڑا ساری آیت کی جان ہے اور اس کے دو لفظوں میں کفار کے لیے دھمکیوں کا اور اہل ایمان کے لیے بشارتوں کا ایک جہان ہے۔ فرمایا کہ اب آئے جس کو آنا ہو اور لڑے جس کو لڑنا ہو اور جمع کرے وہ جتنی جمعیت جمع کر سکتا ہو، اہل ایمان کے ساتھ ہم ہیں ہم!! سبحان اللہ

کیا غم ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

۴- آگے کا مضمون ——— آیات ۲۰-۲۸

مسلمانوں کی تربیت و اصلاح اور تطہیر و تنظیم کا وہی مضمون جو اوپر سے چلا آ رہا ہے اپنے تدریجی انکشافات کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور جن لوگوں کی کمزوریاں اس تقریر کی محرک ہوئی ہیں ان کو کچھ کھلی ہوئی دھمکیاں بھی دی گئی ہیں اور مجموعی طور پر مسلم معاشرہ کو بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ اپنے پیش و عقب سے آگاہ رہو، معاشرے کی برائیاں اور بھلائیاں دونوں مشترک ہوتی ہیں۔ اگر کچھ لوگوں نے کوئی فتنہ برپا

کرنے کی کوشش کی اور دوسروں نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہ کی تو بالآخر وہ فتنہ نیک و بد سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اللہ و رسولؐ کی اطاعت پر جم جاؤ، ان یہود کی روش سے بچو جو اپنے رسول کے سامنے تو دعوے کرتے کہ ہم نے مانا لیکن وہ مانتے نہیں تھے۔ پیغمبرؐ کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہے اس پر دل و جان سے لبیک کہو۔ جو لوگ پیغمبرؐ کی دعوت، سن اور سمجھ کر بھی اس کے لیے اپنے دلوں کے دروازے نہیں کھولتے، ان کے اور ان کے دلوں کے درمیان خدا کا قانون حائل ہو جاتا ہے اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۰-۲۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ
وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ
هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ
الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ
وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا
اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾
وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ج
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ
قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ
النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ
وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ ع
ع ۳ / ۹ / ۱۷

ترجمۂ آیات ۲۰ - ۲۸

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو جب کہ تم سن رہے ہو اور ان لوگوں کی روش نہ اختیار کرو جو دعویٰ تو کرتے کہ ہم نے سنا لیکن سنتے سناتے کچھ نہیں تھے۔ اللہ کے نزدیک بدترین جانور یہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ اور اگر اللہ ان میں کوئی صلاحیت دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق دیتا اور اگر صلاحیت بدوں ان کو سنوا تا تو وہ اعراض کرتے ہوئے منہ پھیرتے۔ ۲۰ - ۲۳

اے ایمان والو! اللہ و رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ رسول تمھیں اس چیز کی دعوت دے رہا ہے جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جایا کرتا ہے اور یاد رکھو کہ اسی کی طرف تمھارا اکٹھا ہونا ہے اور بچتے رہو اس فتنہ سے جو مخصوص طور پر انہی لوگوں کو نہیں لاحق ہوگا جنھوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہوگا اور جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۲۴ - ۲۵

اور یاد کرو جب کہ تم تھوڑے اور ملک میں دبے ہوئے تھے، ڈرتے تھے کہ لوگ تمھیں اچک نہ لیں تو خدا نے تمھیں پناہ دی اور اپنی نصرت سے نوازا اور تم کو پاکیزہ روزی دی تاکہ شکر گزار رہو۔ اے ایمان والو، اللہ و رسول سے بے وفائی اور اپنی امانتوں میں خیانت جانتے بوجھتے نہ کرو اور جان رکھو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد فتنہ ہیں اور یہ کہ اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے۔ ۲۶ - ۲۸

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَلَا تَوَلَّوْا۟ عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ ۝

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ (۲۰-۲۳)

'یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا' خطاب اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن روئے سخن انہی کمزور اور منافق لوگوں کی طرف ہے جن کا ذکر شروع سے چلا آ رہا ہے۔ قرآن کا عام انداز یہی ہے کہ کمزوروں اور منافقوں کی غلطیوں پر گرفت بھی فرماتا ہے تو ان کا ذکر بصیغۂ عام ہی کرتا ہے کہ ان کا فضیحتا نہ ہو اور اگر وہ اصلاح قبول کرنا چاہیں تو قبول کر لیں۔ رہے اچھے لوگ تو وہ بہر حال اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ گویا دوسروں کی غلطیاں ان کے اپنے علم و عمل کو پختہ کرنے کے لیے مزید اسباب فراہم کر دیتی ہیں۔

مطلب عام، لیکن روئے سخن خاص لوگوں کی طرف

رسول سے اعراض اللہ سے اعراض کے ہم معنی ہے

'اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ' میں فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی اللہ و رسول کی اطاعت اس طرح کرو جس طرح ایمان کا تقاضا ہے۔ 'وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ' یعنی رسول کی عین موجودگی میں، جب کہ دونوں کانوں سے اس کی دعوت سن رہے ہو، اس سے اعراض نہ کرو۔ 'وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ' کے الفاظ ان کے رویہ کی شناعت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ جب تم رسول کی موجودگی میں ٹھوکر کھاؤ گے تو کل کو تمہارا کیا حال ہوگا؟ جو لوگ پورے دن کی روشنی میں گرتے ہیں ان کے پاس ان کے گرنے کے لیے کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ 'عَنْهُ' کی ضمیر رسول کی طرف لوٹتی ہے حالانکہ اوپر ذکر اللہ و رسول دونوں کا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رسول سے اعراض اللہ سے اعراض کے ہم معنی ہے، جس نے رسول سے منہ موڑ لیا اس نے خدا سے منہ موڑ لیا۔ خدا سے تعلق اور اس کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس کا رسول ہی ہے۔

ایک اشارہ یہود کی طرف

'وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ' یعنی ان لوگوں کے مانند نہ بنو جو دعویٰ تو 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا کرتے لیکن عمل ان کا 'سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا' پر ہوتا۔ بات اگرچہ اشاروں میں کہی گئی ہے لیکن قرآن کا ہر ذوق رکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ یہ اشارہ یہود کی طرف ہے۔ قرآن نے بڑی وضاحت سے سورۂ بقرہ میں بتایا ہے کہ یہود کہتے تو 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' ہیں لیکن عمل ان کا 'سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا' پر ہوتا ہے اور اس بات کی بھی قرآن نے تصریح کی ہے کہ ان کا یہ رویہ اس کے رسول کی عین موجودگی میں رہا ہے۔ گویا در پردہ ان منافق قسم کے مسلمانوں کو یہ بتا دیا گیا کہ تمہارا یہ طرز عمل اتباع رسول نہیں بلکہ اتباع یہود ہے۔ ایمان کا دعویٰ ہے تو اس مغضوب قوم کے نقش قدم پر نہ چلو۔

خدا کے نزدیک بدترین جانور

'اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ'۔ اگرچہ لہجہ کی درشتی اوپر والے ٹکڑے میں جھلک رہی تھی لیکن اس ٹکڑے میں بالکل نمایاں ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ خدا کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ مطلب یہ کہ اگر تم سب کچھ

سن کر اسی طرح بہرے گونگے بنے اور رسول کی سنی ان سنی کرتے رہے۔ عقل و فہم سے تم نے کام نہ لیا تو تم خدا کے نزدیک بدترین جانور رہو۔ قرآن نے جگہ جگہ یہود اور مشرکین کو بدترین جانور کہا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انھوں نے سننے سمجھنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جو گروہ بھی ان کی روش اختیار کرے گا وہ انھی میں سے ہے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ انسان کا اصلی وصف امتیازی اس کا سننا سمجھنا ہی ہے۔ اس وصف سے یہ اپنے کو محروم کرے تو بس یہ دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہی ہے اور جانور بھی بدترین جانور۔ بدترین اس لیے کہ جانور خواہ کتنا ہی برا ہو وہ اپنی جبلت پر قائم رہتا ہے اور اپنے محل میں اس کی ایک قیمت اور اس کی ایک افادیت ہے لیکن انسان اپنی خصوصیت نوعی سے محروم ہو جائے تو اس کے آگے شیطان بھی اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ یہ عقل و بصیرت سے کام لے تو جس طرح اس کے عروج کی کوئی حد نہیں اسی طرح عقل و بصیرت سے محروم ہو جانے کی صورت میں اس کی پستی کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

وَلَوۡ عَلِمَ اللّٰہُ فِیۡہِمۡ خَیۡرًا لَّاَسۡمَعَہُمۡ ؕ وَلَوۡ اَسۡمَعَہُمۡ لَتَوَلَّوۡا وَّہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ۔ یہ ایک دفع دخل مقدر یعنی ایک پیدا ہونے والے شبہے کا برسر موقع جواب ہے۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب سننے سمجھنے ہی پر انسان کی انسانیت کا انحصار ہے اور اس سے محرومی خدا کو اس درجہ ناپسند ہے کہ اس سے محروم ہو کر انسان اس کے نزدیک بدترین جانور بن جاتا ہے تو وہ اپنی قدرت سے ان کے کان کھول کیوں نہیں دیتا اور ان کی عقل پر پڑے ہوئے پردے ہٹا کیوں نہیں دیتا؟ اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ اللہ اگر ایسے لوگوں کے اندر کوئی صلاحیت پاتا تو ان کو سننے سمجھنے کی توفیق دیتا۔ یہ صلاحیت ان کے اندر اس نے نہیں پائی اس وجہ سے ان کو توفیق نہیں بخشی۔ یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت ہم بار بار کر چکے ہیں کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں خدا کا قانون یہ ہے کہ اس نے ہر انسان کے اندر خیر و شر کے امتیاز کی صلاحیت بخشی ہے جو لوگ اس کو زندہ رکھتے اور اس سے کام لیتے ہیں ان کو مزید ہدایت ملتی ہے اور وہ درجہ بدرجہ علم و عمل میں ترقی کرتے جاتے ہیں، اس کے برعکس ان لوگوں کا حال ہوتا ہے جو خدا کی اس ودیعت کردہ فطری صلاحیت کو ضائع کر بیٹھتے ہیں ان کو مزید ہدایت ملنا تو الگ رہا، قانون الٰہی یہ ہے کہ ان کو جو ہدایت فطرت سے ملی ہوئی ہوتی ہے وہ بھی سلب ہو جاتی ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے اس حقیقت کو نہایت بلیغ پیرایہ میں یوں سمجھایا ہے کہ جو غلام ایک پیسہ میں چور ثابت ہوا اس کو اس کا مالک ایک لاکھ کی امانت کیسے سونپے گا؟

وَلَوۡ اَسۡمَعَہُمۡ لَتَوَلَّوۡا وَّہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ۔ یعنی اگر بدون اس صلاحیت کے خدا ان کے اندر ہدایت ڈالتا تو ڈالنے کو تو وہ ڈال دیتا لیکن وہ ان کے اندر جڑ نہ پکڑتی، ان کی طبیعتیں اس سے باغی

بالآخروہ اس کو اگل دیتے۔ غذا کتنی ہی صالح ہو لیکن معدہ فاسد ہو چکا ہو تو وہ اس کو قبول نہیں کرتا۔ آدمی لقمہ حلق سے اتار تو لیتا ہے لیکن بڑی جلدی قے کر دیتا ہے۔ ایک پودے کی صحیح نشوونما کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ذات سے تندرست ہو بلکہ اس کے لیے زمین کی زرخیزی بھی مطلوب ہوتی ہے۔ ایک مالی اگر ایک بنجر زمین میں عمدہ سے عمدہ پودا لگا دے تو لگانے کو تو وہ لگا دے گا اور چند روز وہ پودا اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل پر زندہ بھی رہے گا لیکن جب زمین کے اندر سے اس کے مزاج کے مطابق اس کو مطلوب غذا نہیں ملے گی تو بالآخر وہ سوکھ جائے گا۔ ٹھیک یہی حال نیکی اور ہدایت کے بیج کا بھی ہے۔ یہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق نشوونما صالح فطرت کی زمین کے اندر پاتا ہے۔ اگر کسی شخص کی فطرت کی زمین شور ہو چکی ہو تو یہ بیج ڈالنے کو تو قدرت اس کے اندر بھی ڈال سکتی ہے لیکن قدرت ہی کا قانون یہ ہے کہ وہ اس کے اندر نشوونما نہ پا سکے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَٱعْلَمُوٓا
أَنَّ ٱللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَقَلْبِهِۦ وَأَنَّهُۥٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (۲۴)

اللہ و رسول کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہے

اوپر گزر چکا ہے کہ انسان کی انسانیت کا انحصار اس کی عقل و بصیرت پر ہے اور اس کی زندگی عبارت ہے اس کی روح اور اس کے دل کی زندگی سے۔ اگر وہ صحیح بات سوچنے سمجھنے سے عاری اور کلمۂ حق سننے اور ماننے سے محروم ہو جائے تو درحقیقت وہ اپنے منشائے تخلیق کے اعتبار سے مردہ ہے۔ چنانچہ قرآن نے کفار کو جگہ جگہ مردہ کہا ہے۔ اللہ و رسول کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہوتی ہے اسی کو قبول کرنے سے بصارت کو بصیرت نصیب ہوتی ہے۔ اسی سے عقل کو وہ نور حاصل ہوتا ہے جو آفاق و انفس کے اسرار و حقائق سے اس کے لیے پردے اٹھاتا ہے۔ اس سے دل کو وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جو اس کو ایک مضغۂ گوشت سے تجلیات و انوارِ الٰہی کا ایک آئینہ بنا دیتی ہے۔ فرمایا کہ اللہ و رسولؐ کی اس دعوت پر لبیک کہو اس لیے کہ اسی سے تم کو حقیقی اور جاوداں زندگی حاصل ہوگی۔ سیدنا مسیحؑ نے اس حقیقت کو یوں واضح فرمایا کہ انسان روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔ اس مضمون کی وضاحت انعام کی آیت ۱۲۲۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَٰهُ الآیہ کے تحت ہو چکی ہے۔

ایک نہایت ہی سخت تنبیہ

وَٱعْلَمُوٓا أَنَّ ٱللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَقَلْبِهِۦ وَأَنَّهُۥٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ۔ یہ تنبیہ ہے اور بڑی ہی سخت تنبیہ ہے ان لوگوں کے لیے جو کسی دعوتِ خیر بالخصوص پیغمبر کی حیات بخش دعوت کی قدر نہیں کرتے بلکہ گونگے بہرے بن جاتے ہیں۔ فرمایا کہ یاد رکھو، جو لوگ یہ روش اختیار کرتے ہیں ان کے اور ان کے دلوں کے درمیان خدا حائل ہو جایا کرتا ہے۔ خدا کے حائل ہونے سے مراد یہاں خدا کے قانون کا حائل ہو جانا ہے۔ اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جو باتیں خدا کے قانون اور اس کی مقررہ سنت کے تحت ظہور میں آتی ہیں، بسا اوقات اللہ تعالیٰ ان کو

براہ راست اپنے فعل کی حیثیت سے تعبیر فرماتا ہے۔ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کے تحت یہ بحث تفصیل سے گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دل پھر ایسے عنان گسیختہ اور بے قابو ہو جاتے ہیں کہ وہ ان کو کسی طرح بھی قابو میں نہیں لا سکتے۔ انسان کا دل جب برائیوں کے پیچھے لگتا ہے تو ایک خاص حد تک تو اس کا حال یہ رہتا ہے کہ انسان اگر متنبہ ہو جائے اور اس کو روکنا چاہے تو روک سکتا ہے اور اس کو اصلاح کی راہ پر لگا سکتا ہے لیکن جب اس حد سے دل آگے بڑھ گیا اور انسان کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس کو لگام دے تو پھر نہ آدمی کا ہاتھ باگ پر رہ جاتا ہے اور نہ پاؤں رکاب میں بلکہ وہ دل کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔ نبی کی دعوت، جیسا کہ اوپر گزرا، آنکھوں، کانوں اور دلوں کو کھولنے کے لیے سب سے زیادہ مؤثر دعوت ہوتی ہے اس وجہ سے جو لوگ اس دعوت سے اپنے کان بند کر لیں وہ خدا کے اس قانون کی زد میں آجاتے ہیں۔ جس کو قرآن نے 'ختم قلوب' یا 'رین' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہاں قرآن نے کمزور اور منافق قسم کے لوگوں کو اسی چیز سے ڈرایا ہے کہ ابھی فرصت باقی ہے، سنبھلنا چاہو تو سنبھل سکتے ہو، نہ سنبھلے، اسی طرح اپنی بیماریوں کی پرورش کرتے رہے تو پھر تمھارے دل اسی طرح مسخ اور مختوم ہو جائیں گے کہ کوئی صیقل بھی ان پر کارگر نہ ہو سکے گا۔ مزید برآں یہ بات بھی یاد رکھو کہ معاملہ یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ آگے خدا کے حضور میں بھی حاضر ہونا ہے۔ اس دن کے احوال و نتائج کو بھی سوچ لو۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲۵)

ہر شخص پر معاشرے کی اصلاح کی بھی ذمہ داری ہے

یہ خطاب پورے معاشرے سے عموماً اور ان لوگوں سے خصوصاً ہے جن پر انفرادی اصلاح کا رجحان غالب تھا اور اس رجحان کے سبب سے انھیں اس امر سے کچھ زیادہ تعلق خاطر نہ تھا کہ دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جھنجھوڑنے کے لیے فرمایا کہ اپنے معاشرے کے اندر ابھرنے والی خرابیوں سے بے تعلق نہ رہو بلکہ اپنے امکان اور اپنی صلاحیت کے حد تک اس کی اصلاح کی کوشش کرو اس لیے کہ معاشرے میں اگر کوئی خرابی جڑ پکڑ لے تو وہ بالتدریج ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور جب وبائے عام کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اس کے برے اثرات و نتائج انہی لوگوں کی حد تک محدود نہیں رہتے جو بالفعل ان برائیوں میں ملوث ہوتے ہیں بلکہ ان خرابیوں پر راضی یا خاموش رہنے والے بھی ان کی زد میں آجاتے ہیں اگرچہ وہ عملاً ان میں مبتلا نہ ہوں۔

اس حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کشتی کے مسافروں کی تمثیل سے سمجھایا ہے کہ اگر کچھ لوگ ایک کشتی میں سفر کریں، کچھ اس کے اوپر کے حصے میں، کچھ نیچے والے حصے میں، نیچے والے یہ محسوس کر کے کہ انھیں پانی کے لیے اوپر جانے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے، یہ فیصلہ کریں کہ ہم کیوں نہ کشتی کے نیچے کے حصے میں سوراخ کر لیں اور اوپر والے یہ خیال کر کے کہ وہ اپنے حصے میں سوراخ کر رہے ہیں ہمیں اس سے کیا سروکار، اس پر خاموش رہیں تو نیچے والوں کے اس فعل کے نتیجہ میں جب کشتی ڈوبے گی تو اوپر والوں اور

نیچے والوں دونوں کو لے کر ڈوبے گی۔

اس بنیاد پر اسلام نے ہر شخص پر دوسروں کو برائی سے روکتے رہنے کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے جو شخص بھی کوئی برائی دیکھے، اگر ہاتھ سے اس کو روک سکتا ہو تو ہاتھ سے روکے، اگر ہاتھ سے نہ روک سکتا ہو تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے۔ اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل سے اس کو برا سمجھے۔ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

یہ آیت جس سیاق میں آئی ہے اگر اس سیاق پر نظر ڈالیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو حق کو ماننے کا زبان سے تو مدعی ہے لیکن اس کے مطالبات پورے کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ ان کو قرآن نے اس بات سے ڈرایا ہے کہ ایسے لوگ اگر اپنے رویے کی اصلاح نہیں کرتے تو خدا کا قانون ان کے اور ان کے دلوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو حق کو مانتے ہیں لیکن اس حق سے انھیں اتنا لگاؤ نہیں ہوتا کہ وہ اس کی خاطر دوسروں کی ناراضگی مول لینے کے لیے تیار ہوں، ان لوگوں کو اس بات سے ڈرایا کہ اگر معاشرے میں کوئی برائی پھیل گئی تو اس کے نتائج بد سے یہ لوگ بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ محفوظ صرف وہ لوگ رہیں گے جو اپنی صلاحیت کی حد تک اپنا حق نصیحت ادا کرتے رہیں گے، قطع نظر اس سے کہ کوئی ان کی بات سنتا ہے یا نہیں اور خوش ہوتا ہے یا ناخوش۔

'وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ' یہ پاداش عمل کے قانون کے بے لچک اور بے رو رعایت ہونے کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے قوانین جس طرح جسمانیات و مادیات میں بے لچک ہیں اسی طرح اخلاقیات میں بھی بے لچک ہیں۔ فاسد آب و ہوا میں سانس لینے والا جس طرح آب و ہوا کے فساد سے لازماً متاثر ہوتا ہے اگر وہ ضروری احتیاطیں نہ کرے، اسی طرح برے ماحول میں زندگی گزارنے والا اس کے برے عواقب کی زد میں آجاتا ہے اگر وہ شرطیں وہ ملحوظ نہ رکھے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ اس معاملے میں قانون الٰہی کسی کی رعایت اور کسی کی جانبداری نہیں کرتا۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲۶)

ابتدائے اسلام میں مسلمانوں پر خدا کے انعامات

اطاعت اللہ اور اطاعت رسول کے جس مطالبہ سے یہ کلام چلا ہے اس کو مؤکد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اپنے انعامات گنائے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اللہ و رسول نے جس راہ کی تمھیں دعوت دی ہے اب تک تم نے دیکھا کہ اس راہ میں ہر قدم پر اس نے تمھیں سہارا دیا ہے۔ تم تھوڑے تھے، کمزور اور دبے ہوئے تھے، ڈرتے تھے کہ قریش تمھیں اچک نہ لیں تو خدا نے تمھیں مدینہ میں پناہ دی، بدر میں اپنی خاص نصرت سے تمھیں نوازا، تمھارے لیے پاکیزہ معاش و معیشت کی راہیں کھول دیں۔ یہ سب باتیں مقتضی ہیں کہ تم خدا کے شکر گزار اور اس کے دین کے کارگزار بندے بنو۔ اس اندیشے میں مبتلا نہ ہو کہ

اس راہ پر چل کر تم کسی خطرے میں پھنس جاؤ گے۔ جس نے اب تک تمہارے ساتھ اتنا اچھا معاملہ کیا ہے، یہ گمان نہ کرو کہ وہ آیندہ تمہارے ساتھ کوئی برا معاملہ کرے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۲۷-۲۸)

ہر عہد ایک امانت ہے

یہ آیت ٹھیک آیت ۲۴ کے مقابل میں ہے۔ اس میں جس بات کا مطالبہ کیا گیا ہے اس کے ضد سے اس میں روکا گیا ہے اور 'لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ' میں جس شکر گزاری کا حق یاد دلایا گیا ہے اس کے منافی رویہ سے اس میں باز رہنے کی تاکید ہے۔ ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ شکر کی اصل حقیقت خدا کا حق پہچاننا، اس کا اعتراف کرنا اور خلوص کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ اس کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اللہ و رسول سے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا اقرار کر کے بے وفائی اور غداری نہ کرے بلکہ ہر حال میں اس عہد کو پورا کرے۔ ہر عہد ایک امانت ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی خلاف ورزی خفیہ ہو یا علانیہ، خیانت ہے۔

لفظ امانت کا وسیع مفہوم

'وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' یہ اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جو بقرہ ۴۲ میں 'وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم بیان کر چکے ہیں کہ لائے نفی کا اعادہ نہ کرنا اس بات کا قرینہ ہے کہ حق اور باطل کو گڈمڈ کرنا اخفائے حق کو مستلزم ہے۔ اسی طرح یہاں ہر چند یہ جملہ 'لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ' کے تحت ہی ہے لیکن صرف نہی کا اعادہ نہیں فرمایا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ و رسول سے خیانت ہی ہے جو لوگوں کے لیے اپنی امانتوں اور ذمہ داریوں میں خیانت کے لیے راہ کھولتی ہے۔ لفظ 'امانت' پر ہم نساء آیت ۵۸ کے تحت تفصیل سے بحث کر آئے ہیں کہ قرآن میں یہ لفظ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ تمام حقوق اور ذمہ داریاں خواہ وہ کسی عہد و اقرار کے تحت عائد ہوتی ہوں یا حق اور ذمہ داری کے معروف فطری قانون کے تحت سمجھی اور مانی جاتی ہوں یا وہ صلاحیتیں اور نعمتیں ہوں جو انسان کو ودیعت ہوئی ہیں سب اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ فرمایا کہ جانتے بوجھتے ان امانتوں میں کوئی خیانت نہ کرو۔ 'وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' کا ٹکڑا یہاں جس سیاق میں ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ لوگ، جن کی طرف اشارہ ہے جانتے بوجھتے یہ حرکت کر رہے تھے اور مقصود اس ٹکڑے کے لانے سے ان کی مذمت ہے لیکن بجائے خود یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ شریعت میں کوئی فعل جرم اسی وقت بنتا ہے جب اس کا ارتکاب علم اور ارادے کے ساتھ کیا جائے۔

اصل بیماری

'وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ' یہ اصل بیماری کا پتہ دیا ہے کہ جو لوگ خدا اور رسول کی محبت و اطاعت میں کمزور ہیں وہ درحقیقت مال و اولاد کی محبت میں گرفتار ہیں۔ مال و اولاد کی محبت جب اس درجہ غالب آجائے کہ آدمی ان کے پیچھے خود اس کے حقوق و فرائض سے جی چرانے لگے

جس کے فضل سے مال و اولاد ملے ہیں تو پھر مال و اولاد فتنہ بن جاتے ہیں۔ خدا اور رسول سے بے وفائی ہو یا دوسروں کے حقوق میں خیانت، اگر اس کے اسباب کا سراغ لگایا جائے تو اس کی تہ میں انہی دونوں چیزوں کی حد سے بڑھی ہوئی محبت نکلے گی۔ اس اعتبار سے یہ نفاق کا سب سے بڑا دروازہ ہیں اور اسی پہلو سے ان کو فتنہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس فتنہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اس اجرِ عظیم کو یاد رکھے جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے محفوظ کیا ہے جو مال یا اولاد کی محبت میں خدا اور رسول سے بے وفائی نہیں کرتے بلکہ جب ان کے سامنے کوئی ایسی آزمائش آتی ہے جس میں ایک طرف خدا اور رسول کی خوشنودی ہو، دوسری طرف مال و اولاد کی محبت تو وہ ہمیشہ خدا اور رسول کی طرف جھکتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے باوفاؤں کے لیے اللہ کے ہاں بڑا اجر ہے۔

۶۔ آگے کا مضمون —— آیات ۲۹-۴۰

آگے پہلے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ اگر تم اللہ کے عہد و پیمان پر مضبوطی سے قائم رہے، مال و اولاد کی محبت میں پھنس کر تم نے کمزوری نہ دکھائی تو جلد وہ وقت آ جائے گا کہ وہ تمہارے لیے فرقان نمایاں کرے گا اور وہ سارے حجابات چاک ہو جائیں گے جو آج حق کے پوری طرح نمایاں ہونے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد نبی اس بہترین تدبیر کی طرف اشارہ فرمایا جو اس نے اپنے رسول کو کفار کی متفقہ سازش سے بچانے اور اس کے لیے ہجرت کی راہ کھولنے کے لیے اختیار فرمائی۔ یہ ہجرت علیہ السلام کو دیباچہ اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کی تمہید ہوئی۔ اب تک کفار قرآن کے انذار کا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ کہتے تھے اگر یہ دعوت حق ہے تو اللہ ہم پر کوئی عذاب کیوں نہیں بھیج دیتا؟ لیکن اللہ نے ان پر عذاب نہیں بھیجا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی قوم پر فیصلہ کن عذاب نہیں بھیجتا جب تک پیغمبر ان کے اندر موجود رہتا ہے لیکن اب جب کہ پیغمبر اور مومنین ہجرت کر چکے ہیں عذاب کے آنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی ہے۔

پھر کفار کے مستحق عذاب ہونے کے وجوہ بیان ہوئے ہیں۔ بیت اللہ کی تولیت اور دینداری کے بس رسوم کے غرّے میں وہ جو یہ گمان کیے بیٹھے تھے کہ وہ خدا کے دین کو تھامے ہوئے ہیں، فرمایا کہ ان کا یہ غرہ اب ختم ہو جانے کا وقت آ گیا ہے۔ اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین سے روکنے اور اس دین کو شکست دینے کے لیے وہ جو زر پاشیاں کر رہے ہیں بیان کیے کہ یہ سرمایہ حسرت بنیں گی، وہ دنیا میں شکست کھائیں گے اور آخرت میں اللہ ان سب کو اکٹھا کر کے جہنم میں جھونک دے گا۔

آخر میں قریش کو دھمکی ہے کہ بہتر ہے کہ وہ اپنی روش بدلیں اور اس دعوت کو قبول کر لیں ورنہ یاد

رکھیں کہ ان کے سامنے بھی وہی انجام آنے والا ہے جو رسولوں کی تکذیب کرنے والی پچھلی قوموں کے سامنے آچکا ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت ہے کہ ان سے جنگ جاری رکھو تا آنکہ فتنہ کا قلع قمع ہو جائے اور اس سرزمین پر اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین باقی نہ رہے۔ اللہ تمہارا یار و ناصر ہے —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ آیات
عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ ۲۹-۴۰
وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ
وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَاِذَا تُتْلٰى
عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاۗءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ
اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ
كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً
مِّنَ السَّمَاۗءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ
لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ
يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ
عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَاۗءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَاۗؤُهٗٓ اِلَّا
الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ
عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاۗءً وَّتَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا
كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ

يُغْلَبُونَ ۬ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾ لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ
مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ
جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٣٧﴾ قُلْ ع ۹ ۱۸
لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَنْتَهُوا يُغْفَرْ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَفَ وَإِنْ يَعُودُوا
فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْأَوَّلِينَ ﴿٣٨﴾ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ
فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا
يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٣٩﴾ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ
نِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿٤٠﴾

ترجمۂ آیات ۲۹-۴۰

اے ایمان لانے والو، اگر تم اللہ سے ڈرتے رہے تو وہ تمھارے لیے فرقان نمایاں کر دے گا اور تم سے تمھارے گناہ جھاڑ دے گا اور تمھاری مغفرت فرمائے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ خیال کرو جبکہ کفار تمھارے باب میں سازش کر رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ سازش کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر فرما رہا تھا اللہ بہترین تدبیر فرمانے والا ہے۔ ۲۹-۳۰

اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتیں، کہتے، بس سن لیا۔ اگر ہم چاہیں ہم بھی ایسا ہی کلام پیش کر دیں۔ یہ تو بس اگلوں کے فسانے ہیں اور یاد کرو جب انھوں نے کہا کہ اے اللہ اگر یہی حق ہے تیرے پاس سے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب لا۔ اور اللہ ان کو عذاب دینے کا روادار نہ تھا جب کہ تم ان میں موجود تھے اور اللہ ان کو عذاب دینے کا روادار نہیں ہو سکتا جب کہ وہ مغفرت کے طلب گار ہوں۔ اور ان کو کیوں نہ عذاب دے گا جب کہ وہ مسجد حرام سے

روکتے ہیں در آنحالیکہ وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی تو صرف خدا سے ڈرنے والے ہو سکتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت سے واقف نہیں اور بیت اللہ کے سامنے ان کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے سوا کچھ نہیں۔ تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں۔ ۳۱-۳۵

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے وہ اپنے مال اللہ کی راہ سے روکنے کے لیے خرچ کر رہے ہیں۔ وہ اس کو خرچ کریں گے، پھر یہ ان کے لیے سرمایۂ حسرت بنے گا، پھر یہ مغلوب ہوں گے اور یہ کافر جمع کر کے جہنم کی طرف ہنکائے جائیں گے تاکہ اللہ خبیث کو طیب سے چھانٹ کر الگ کرے اور خبیث کو ایک دوسرے پر ڈھیر کرے، پھر اس کو جہنم میں جھونک دے۔ یہی لوگ نامراد ہونے والے ہیں۔ ۳۶-۳۷

ان کفر کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر یہ باز آجائیں تو جو کچھ ہو چکا ہے وہ معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہ پھر یہی کریں گے تو اگلوں کے باب میں سنت الٰہی گزر چکی ہے اور ان سے جنگ کرو تا آنکہ فتنہ کا قلع قمع ہو جائے اور سارا دین اللہ کا ہو جائے۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر انھوں نے اعراض کیا تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا مولیٰ و مرجع ہے۔ کیا ہی خوب مولیٰ اور کیا ہی اچھا مددگار! ۳۸-۴۰

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن تَتَّقُوا۟ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ ذُو ٱلْفَضْلِ ٱلْعَظِيمِ (۲۹)

'فرقان' کا مفہوم

'فُرْقَان' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دے۔ یہ امتیاز پیدا کرنے والی شے داخلی بھی ہو سکتی ہے، خارجی بھی، علمی اور عقلی بھی ہو سکتی ہے، عملی اور واقعاتی بھی۔ قرآن نے دلائل

براہین کو 'فرقان' کہا ہے جیسا کہ بقرہ آیت ۱۸۵ میں ہے، اس لیے کہ ان سے حق و باطل میں امتیاز ہوتا ہے۔ خود قرآن بلکہ اصل تورات کے لیے بھی ایک سے زیادہ مقامات میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس لیے کہ اللہ نے یہ کتابیں حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لیے اتاریں۔ اسی طرح اس سورہ کی آیت ۴۱ میں غزوۂ بدر کو فرقان سے تعبیر فرمایا ہے، اس لیے کہ اس جنگ نے واقعات کی دنیا میں یہ دکھا دیا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔

مسلمانوں سے غلبہ کا وعدہ

اس آیت میں مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تم تقویٰ پر مضبوطی سے جمے رہے، یعنی اللہ و رسول کے ساتھ بدعہدی و بے وفائی کے مرتکب نہ ہوئے تو اللہ جلد وہ وقت لائے گا کہ مطلع پر جو غبار نظر آ رہا ہے یہ سب چھٹ جائے گا اور حق اس طرح غالب ہو کر چمکے گا کہ دشمنوں کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جائیں گی۔ قرینہ بتا رہا ہے کہ یہاں یہ لفظ اسلام اور مسلمانوں کے کامل غلبہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اگرچہ ایک فرقان کا ظہور معرکۂ بدر میں بھی ہو چکا تھا جس کو مسلمان دیکھ چکے تھے تاہم ابھی باطل دہنے بائیں ہر طرف سے مسلمانوں کو گھیرے ہوئے تھا اس وجہ سے ایک گروہ تذبذب کی حالت میں مبتلا تھا اور یہی تذبذب اس کو ان کمزوریوں میں مبتلا کر دیتا تھا جو اوپر زیر بحث آئی ہیں۔ اس طرح کے مذبذب لوگوں کو حق پر جمانے کے لیے فرمایا کہ وہ وقت دور نہیں ہے جب باطل کی یہ ساری گھٹائیں چھٹ جائیں گی اور آفتاب حق اپنی پوری تابانی سے تمہارے سامنے آ جائے گا۔ بس یہ شرط ہے کہ تم اللہ و رسول کی اطاعت اور تقویٰ پر جمے رہو۔

'وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ' الآیہ یہاں 'سیات' سے مراد وہ چھوٹی موٹی غلطیاں اور کوتاہیاں ہیں جو بشری بشریت کا لازمہ ہیں۔ فرمایا کہ اگر بڑے جرموں سے تم بچتے رہے تو اللہ تعالیٰ فروگزاشتوں اور کوتاہیوں پر تمہیں نہیں پکڑے گا، وہ بڑے فضل والا ہے۔ کبائر سے بچنے والوں کے صغائر معاف ہو جاتے ہیں۔

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ (۳۰)

'اثبات' کا اصل لغوی مفہوم پابند کر دینا، روک دینا ہے، جس میں قید کر دینا بھی شامل ہے۔

قریش کی سازشوں کی طرف اشارہ

یہ واراللندوہ کی اس سازش کی طرف اشارہ ہے جو قریش کے لیڈروں نے آپ کی دعوت حق کو یک قلم ختم کر دینے کے لیے کی۔ اس کے لیے مختلف لیڈروں کی طرف سے مختلف تجویزیں پیش ہوئیں۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غور و بحث کے بعد قتل کی تجویز پر اتفاق ہوا اور قتل کی یہ تدبیر سوچی گئی کہ قریش کے تمام بڑے خاندان اس میں شریک ہوں تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لوگ قصاص کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

'خیر الماکرین' کا مفہوم

'وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ' لفظ 'مکر' پر آل عمران آیت ۵۴ کے تحت

بحث گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی طرف جب اس کی نسبت ہوتی ہے تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ خدا کی تدبیر دوسروں کی سازشوں پر ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ ظاہراً اس تدبیر کو دشمن اپنی ہی فتح مندی کیوں نہ تصور کرے لیکن بالآخر وہ حق کی فتح مندی کے نہایت وسیع دروازے کھول دیتی ہے۔ اس کی بہترین مثال خود یہ واقعۂ ہجرت ہے۔ قریش نے آنحضرتؐ کی ہجرت کے بعد اطمینان کا سانس لیا کہ چلو پہلو کا کانٹا نکل گیا لیکن جلد ہی حالات نے ثابت کر دیا کہ کانٹا نہیں نکلا بلکہ ان کے جسد قومی کی روح نکل گئی۔ اس کے بعد اسلام کو نشوونما کے لیے آزاد فضا مل گئی اور قریش مکہ میں، جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے، اپنی قضائے مبرم کے انتظار کے لیے رہ گئے۔

وعدۂ فرقان کی تاکید مزید

یہاں اس واقعہ کو یاد دلانے سے مقصود اسی وعدۂ فرقان کو مؤکد کرنا ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دیکھنا چاہو کہ خدا اپنی تدبیر و کارسازی سے کس طرح ناموافق حالات کو موافق اور مخالف ہواؤں کو سازگار بنا دیتا ہے تو اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھارے پیغمبرؐ کی زندگی خود اس کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ ایک وقت تھا جب اسلام کی قسمت صرف پیغمبرؐ کے وجود اقدس اور چند لے بادہ مددگار نفوس کے ساتھ وابستہ تھی۔ قریش نے فیصلہ کیا کہ پیغمبرؐ کو قتل کر دیں کہ سارا قصہ ہی تمام ہو جائے۔ اس کے لیے سب نے متفق ہو کر سازش کی لیکن اللہ نے ایسی تدبیر فرمائی کہ پیغمبرؐ اپنے خونی دشمنوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر نکل آئے اور کوئی ان کا بال بیکا نہ کر سکا۔ پھر صرف یہی نہیں ہوا کہ پیغمبرؐ نکل آئے بلکہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ سورج گہن سے نکل آیا۔ قریش سمجھے کہ جب پیغمبرؐ اپنی قوم سے جلاوطن ہو کر کسی غیر قوم میں چلے جائیں گے تو ان کی دعوت ایک اجنبی ماحول میں خود بخود مرجائے گی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کارسازی سے دکھا دیا کہ اسلام کے پودے کی نشوونما کے لیے سب سے زیادہ زرخیز اور مہرپرور سرزمین یثرب ہی کی سرزمین تھی جس کی طرف کفار نے خود اسلام کو دھکیل کر بھیجا۔ خدا اپنی اسکیمیں اسی طرح بروئے کار لاتا ہے۔ دشمن سمجھتا ہے کہ بازی اس نے جیتی، لیکن حقیقت میں داؤں خدا کا کامیاب ہوتا ہے۔ وہ حق کے دشمنوں ہی کے ہاتھوں جب چاہتا ہے وہ کام کرا دیتا ہے جس میں حق کی فتح مندی اور خود دشمن کی موت مضمر ہوتی ہے تو موجودہ نامساعد حالات سے ہراساں نہ ہو۔ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ خدا پر بھروسہ رکھو۔ انہی تاریکیوں کے پردے سے بہت جلد یوم فرقان برآمد ہونے والا ہے۔

خطاب کی ایک بلاغت

اس آیت کا خطاب، جیسا کہ وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ سے واضح ہے اگرچہ آنحضرتؐ سے ہے لیکن یہ اپنے موقع و محل اور اپنے مدعا کے اعتبار سے دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک پہلو سے یہ اوپر کے مضمون سے جڑتی ہے، دوسرے پہلو سے آگے آنے والے مضمون کی تمہید ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

خطاب کرکے یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ اب تک قریش جو عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے اور ہم طرح دیے جا رہے تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم بے بس تھے بلکہ یہ تھی کہ تم ان کے اندر موجود تھے لیکن اب جب کہ تم ان کے اندر سے نکل گئے تو اب کون سی چیز ہے جو ان کو ہمارے تازیانۂ عذاب سے بچا سکتی ہے؟ اب تو امان کی سپر ہے [illegible] وں نے خود اپنے کو محروم کر لیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ اس نازک موقع پر وہ اپنے پیغمبر پر یہ واضح فرما دے کہ اس کا مرتبہ و مقام اللہ کی نظروں میں کیا ہے، اس وجہ سے تقاضائے بلاغت یہ ہوا کہ یہاں اسی کو براہ راست مخاطب کرکے یہ بات کہہ دی جائے کہ غم نہ کرو کہ انھوں نے تم کو نکال دیا ہے، یہ تو تمھارے ہی صدقے میں جی رہے تھے، اب یہ دیکھ لیں گے کہ ہم ان کی کیسی مرمت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس سے اس فرقان کے ظہور کی بشارت بھی امت کو دے دی گئی جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا ۙ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۳۱-۳۲)

قریش کے مطالبہ کا واضح جواب

یہ مضمون انعام آیت ۴،۹ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہاں یہ آیتیں یہ واضح کرنے کے لیے آئی ہیں کہ قریش کی طرف سے برابر خدا کو کس کس طرح کے چیلنج پر چیلنج دیے جا رہے تھے اور پیغمبر کو زچ کرنے کے لیے کیا کیا شیخیاں بگھاری جا رہی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے چیلنج کے جواب میں ان پر عذاب نہیں بھیجا جس سے ان کی جسارت بڑھتی گئی اور وہ اپنے باطل کو حق باور کرانے کے لیے اور بھی زیادہ دلیر ہو گئے۔ وہ اپنی رعونت کے باعث یہ نہ سمجھ سکے کہ ان کے اس پیہم مطالبہ کے باوجود کہ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ، ہم نے اب تک ان کو کیوں ڈھیل دی؟ آج وہ سوال کا واضح جواب سن لیں۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ (۳۳)

عذاب الٰہی کے باب میں سنت الٰہی

یہ جواب ہے اس سوال کا جو اوپر مذکور ہوا اور چونکہ مقصود اس موقع پر خاص طور پر پیغمبر کی دل نوازی ہے اس وجہ سے خطاب پیغمبر سے ہوا۔ فرمایا کہ اللہ اس بات کا روادار نہیں ہو سکتا تھا کہ ان پر عذاب نازل فرمائے درآنحالیکہ تم ان کے اندر موجود ہو۔ یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی قوم پر عذاب بھیجنے کے معاملے میں مقرر فرمائی ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ نبی جب تک اپنی قوم کے اندر موجود رہتا ہے وہ قوم کے اندر بمنزلہ دل کے ہوتا ہے۔ وہ قوم کے لیے اپنے رب سے مغفرت بھی مانگتا رہتا ہے اور قوم کو استغفار کی دعوت بھی دیتا رہتا ہے۔ قوم کے اندر اس کا وجود اس بات کا شاہد ہے کہ ابھی قوم میں زندگی کی رمق باقی ہے۔ اس کی دعوت سے ان لوگوں کو زندگی ملتی ہے

جن کے اندر رجاباتِ ایمانی قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور ان کا استغفار بھی قوم کے لیے سپر بن جاتا ہے۔ قوم کے اشرار، خواہ کتنی ہی شرارتیں اور خدا اور رسول کو کتنا ہی چیلنج کریں، لیکن اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرماتا ہے اور اگر ان کو کسی آفت میں مبتلا کرتا بھی ہے تو اس کی نوعیت ایک تنبیہ کی ہوتی ہے نہ کہ فیصلہ کن عذاب کی۔ لیکن جب قوم اپنی سرکشی میں اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ نبی کے قتل کے منصوبے بنانے لگتی ہے اور اپنے اندر کے صالحین پر زندگی دشوار کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ نبی اور اس کے ساتھیوں کو ہجرت کا حکم دے دیتا ہے جس کے بعد قوم اس امان سے محروم ہو جاتی ہے جو نبی اور صالحین کی برکت سے اسے حاصل رہی ہوتی ہے۔ پھر دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت لازماً پیش آکے رہتی ہے۔ اگر نبی کے اوپر ایمان لانے والے صرف گنتی کے چند نفوس ہی ہوتے ہیں تو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد قوم پر عذابِ الٰہی آجاتا ہے جو خدا کی زمین کو اس [illegible] کے وجود سے پاک کر دیتا ہے اس لیے کہ باطل محض کی پرورش اس کائنات کی فطرت اور فاطر کائنات کی حکمت کے خلاف ہے اور اگر نبی پر ایمان لانے والوں کی تعداد بھی معتدبہ ہوتی ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں ہوا، تو اہلِ حق اور اہلِ باطل میں کشمکش شروع ہوتی ہے اور باطل حق سے ٹکرا ٹکرا کر بالآخر ایک دن پاش پاش ہو کر نابود ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرقانِ حق کو پوری طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ 'جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا'۔ 'وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ' یعنی ہر چند نبی کی ہجرت کے بعد اب ان سے امان اٹھ چکی ہے۔ اب کوئی چیز ان کو عذاب سے بچانے والی نہیں رہ گئی ہے لیکن وہ استغفار کرنے والے بنیں تو خدا انھیں عذاب سے بچائے رکھے گا۔ گویا اوپر والے ٹکڑے میں جو شدید قسم کی تہدید ہے اس ٹکڑے نے اس کو ذرا نرم کر دیا ہے کہ اب بھی ان کے لیے موقع ہے کہ چاہیں تو اپنی روش بدلیں، خدا سے معافی مانگیں اور اپنے آپ کو اس کی پکڑ سے بچا لیں۔ یوں سمجھیے کہ تہدید کے بعد یہ قریش کو دعوتِ استغفار ہے۔ آگے یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔ 'قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ' (ان کفر کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر وہ باز آ گئے تو جو کچھ ہو چکا ہے اس کو معاف کر دیا جائے گا)۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۳۴-۳۵)

قریش کی غلط فہمی

'وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ' اردو میں اس اسلوب کا مدعا یہ ہو گا کہ آخر ان کو ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ خدا ان کو عذاب نہیں دے گا! یہ قریش کے اس غرورِ باطل پر ضرب لگائی گئی ہے جو خانہ کعبہ کی تولیت اور اس سے متعلق بعض رسوم و خدمات کی ادائیگی کی بنا پر ان کو تھا۔ قوموں کی یہ عجیب

مشترک بدقسمتی رہی ہے کہ انھوں نے اللہ کے دین کو تو ہمیشہ اپنی خواہشات و بدعات کے سانچہ میں ڈھال کر مسخ کیا لیکن انہی مسخ شدہ رسوم کی پرستش کو اتنی اہمیت دی کہ اپنے آپ کو دین کی محسن، خدا کی چہیتی اور محبوب بنا بیٹھیں اور یہ گمان کیا کہ جب ان کے ہاتھوں خدمتِ دین کے یہ کارنامے انجام پا رہے ہیں تو خدا ان پر کس طرح ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ اسی فتنہ میں یہود مبتلا ہوئے، اسی میں نصاریٰ ہلاک ہوئے، یہی گمراہی قریش کو پیش آئی اور بڑے غم سے کہنا پڑتا ہے کہ اسی فتنہ میں شیطان نے اس امت کو بھی ڈال دیا۔ قریش کو یہ زعم تھا کہ وہ خانۂ کعبہ کے متولی، رفادہ اور سقایا کی خدمتیں انجام دینے والے اور حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ اتنے سارے نسبی و حسبی امتیازات کے بعد خدا کے ہاں مقرب و محترم ہونے کے لیے اور کیا چاہیے۔ اس غرور کے سبب سے پیغمبرؐ کی طرف سے عذاب کے ڈراوے ان پر بڑے شاق گزرتے۔ وہ اپنے آپ کو خانۂ کعبہ کا پاسبان سمجھے بیٹھے تھے اور ساتھ ہی یہ زعم بھی ان کو تھا کہ خانۂ کعبہ بھی ان کا پاسبان ہے۔

'وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ' فرمایا کہ مسجد حرام کی تولیت کا یہ زعمِ باطل ان کو کس طرح عذاب سے بچا سکتا ہے۔ جب کہ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے ان بندوں کو اس گھر سے روکتے ہیں جو اس کے سب سے زیادہ حق دار ہیں، جو اصل دینِ ابراہیمی کے حامل ہیں اور جو اس گھر کو توحید کی اذان اور خدائے واحد کی عبادت سے از سرِ نو معمور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اشارہ مسلمانوں کی طرف ہے جو صرف اس گھر ہی سے نہیں بلکہ اس شہر سے بھی نکالے جا رہے تھے جس میں یہ گھر واقع تھا۔

قریش کے دعوائے تولیتِ بیت اللہ کی نفی

'وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ'، یہ ان کے دعوائے تولیت کی نفی کر دی کہ یہ اس گھر کے متولی کہاں سے ہوئے؟ اس کے متولی تو صرف اللہ کے متقی بندے ہی ہو سکتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہ خائن، غدار اور اس گھر کے مقصدِ تعمیر اور اس کی حرمت کے برباد کرنے والے ہیں اس وجہ سے نہ انھیں اس پر مسلط رہنے کا کوئی حق ہے، نہ ان کے نام پر انھیں خدا سے کسی رعایت کی امید کرنی چاہیے۔ اس گھر کی تولیت کے اصلی حقدار ہمارے وہ متقی بندے ہیں جو ان ظالموں کے ہاتھوں اس سے روک دیے گئے ہیں۔

اس مقام پر وہ بات یاد رکھنی چاہیے جو بقرہ ۱۲۴ میں گزر چکی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک عظیم اُمّت کی امامت کے منصب پر سرفراز کرنے کا وعدہ فرمایا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ کیا یہ منصب میری ذریت کو بھی حاصل رہے گا؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ 'لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ' میرا یہ عہد تمھاری ذریت کے صالحین کے لیے ہے، 'ظّٰلِمِيْنَ' اس میں شامل نہیں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس امامت کا مرکز (مثابہ) بیت اللہ قرار پایا اس وجہ سے آپ کی اس دعا اور اللہ تعالیٰ کی تصریح کے بموجب اس گھر کی تعمیر ہی کے وقت یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ اس کی تولیت اور ذریتِ ابراہیمؑ کی قیادت و امامت کے اصلی وارث صرف وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی توحید پر قائم رہنے والے، اس کے

حدود و قیود کی پابندی کرنے والے اور اس کے عہد و میثاق کا احترام کرنے والے ہوں گے نہ کہ وہ جنھوں نے ملتِ ابراہیمؑ اور بیت اللہ الحرام سب کی آبرو مٹا کر رکھ دی ہے۔ یہاں سیدنا مسیحؑ کے وہ الفاظ بھی یاد رکھیے جو اسی طرح کے موقع پر آنجناب نے بیت المقدس کی تولیت کے مدعی فقیہوں اور پروہتوں کو مخاطب کر کے فرمائے تھے کہ تم نے میرے باپ کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا ڈالا ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ میں اس عام جہالت و بے خبری کی طرف اشارہ ہے جس میں اہل عرب اس وقت مبتلا تھے۔ ایک طویل مدت تک جاہلیت کی تاریکی میں زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ اپنی اصل تاریخ بالکل بھلا بیٹھے تھے۔ انھیں قومی تفاخر کے طور پر اتنی بات تو یاد رہی کہ وہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں لیکن اس سے آگے انھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ حضرت ابراہیمؑ اس سرزمین پر کیوں تشریف لائے، ان کی دعوت کیا تھی، وہ جس ملت کے داعی ہوئے اس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں، حضرت اسماعیل کو انھوں نے یہاں کیوں بسایا، خانہ کعبہ کی تعمیر کس مقصد کے لیے ہوئی اور اس گھر کے تعلق سے ذریت اسمٰعیلؑ کو اللہ کے دین کی کیا کیا امانتیں اور کیا ذمہ داریاں سپرد ہوئیں۔ چند معاشرتی رسوم اور حج کے کچھ مناسک جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے چلے آرہے تھے ان میں بھی اتنی تبدیلیاں ہو گئی تھیں کہ اصلی اور ملاوٹ میں امتیاز مشکل ہو گیا تھا۔ خانہ کعبہ کو انھوں نے اپنا قومی معبد بنا لیا تھا جس کی کلید برداری اور اس کے مختلف شعبوں کی سربراہی وراثت کے طور پر مختلف خاندانوں میں منتقل ہوتی رہتی۔ جن پر آبائی جاگیر کی طرح ان کو فخر بھی ہوتا اور اسی حیثیت سے وہ ان پر متصرف بھی ہوتے۔ قرآن نے ان کی اسی جہالت کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے کہ یہ خانہ کعبہ کی تولیت کے مدعی تو ہیں لیکن انھیں کچھ خبر نہیں کہ یہ خانہ کعبہ ہے کیا چیز اور اس کی تولیت کے شرائط کیا ہیں؟

خانہ کعبہ کی تعمیر کا اصل مقصد

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ —— یہ ایک مثال بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ نہ یہ خانہ کعبہ کی تولیت کے اہل ہیں نہ انھیں اس گھر کے مقصد تعمیر کا کچھ پتا ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے جس مقصد کے لیے کی تھی اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ یہاں سورۂ ابراہیم کی مندرجہ ذیل آیات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا	اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی، اے میرے رب،
الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ	اس سرزمین کو پر امن سرزمین بنا دے اور مجھ کو
نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۞ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ	اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے محفوظ رکھ۔
كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ	اے میرے رب، ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کر رکھا ہے
فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ	سو جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری

غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسۡكَنتُ
مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ
عِندَ بَيۡتِكَ ٱلۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُواْ
ٱلصَّلَوٰةَ فَٱجۡعَلۡ أَفۡـِٔدَةٗ مِّنَ ٱلنَّاسِ
تَهۡوِيٓ إِلَيۡهِمۡ وَٱرۡزُقۡهُم مِّنَ ٱلثَّمَرَٰتِ
لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُونَ (ابراہیم - ۱۴ : ۳۷)

نافرمانی کرے تو تو غفور رحیم ہے۔ اے
ہمارے رب، میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو تیرے
محترم گھر کے پاس ایک بن کھیتی کی سرزمین میں بسایا
ہے۔ اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں۔ پس
تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر اور ان کو پھلوں کی
روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرے شکر گزار رہیں۔

خانہ کعبہ کے مقصد کی بربادی

اس دعا کے الفاظ پر غور کیجیے تو اس سے واضح ہو جائے گا کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ میں کیوں بسایا تھا، اپنی ذریت کے لیے انھوں نے کیا دعا فرمائی، بیت اللہ کی تعمیر کا مقصد کیا تھا اور ذریت اسمٰعیل کو اس گھر کے جوار میں بسانے سے ان کے پیش نظر کیا مدعا تھا؟ خاص طور پر رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ کے الفاظ شاہد ہیں کہ جس طرح بیت اللہ اللہ کی عبادت کا مرکز بنایا گیا تھا۔ اسی طرح ذریت اسمٰعیل کو اس گھر کے جوار میں بسانے سے اصل مدعا نماز کا اہتمام و قیام تھا۔ لیکن قریش نے جس طرح بیت اللہ کو شرک و بت پرستی کا ایک گڑھ بنا کے رکھ دیا اسی طرح نماز کی بھی، جس کی خاطر ہی انھیں یہاں بسایا گیا تھا، بالکل آبرو مٹا کر رکھ دی۔ فرمایا کہ ان کی نماز کیا ہے، سیٹی بجانا اور تالی پیٹنا۔ مُکا، یمکو، مکاءٌ کے معنی شسکارنے اور منہ سے سیٹی بجانے کے ہیں۔ 'تصدیہ' کے معنی تالی پیٹنے کے ہیں۔ قرآن نے نہایت بلاغت سے ان کی عبادت کی ظاہری ہیئت ہی سے نمایاں کر دیا کہ بھلا اس مسخرا پن کو نماز سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ صورت بین حالت مپرس۔ ہم کسی دوسرے مقام میں اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ جانچنے کے لیے کہ کیا بات دین کی ہے، کیا نہیں ہے جہاں باطنی کسوٹیاں ہیں وہیں ظاہری کسوٹیاں بھی ہیں۔ اگر کوئی شخص دین کا ذوق رکھتا ہو تو بہت سی بدعتوں کو ان کی ظاہری ہیئت ہی سے پہچان جاتا ہے کہ ان خرافات کو دین سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ تعزیہ داری کے رسوم مزاروں پر ہونے والی خرافات اور متصوفین کی مجالس کی حرکتیں، ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کی لغویت کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی علمی کاوش کی ضرورت ہو۔ ہر صاحب ذوق بیک نظر دیکھ کر فیصلہ کر لیتا ہے کہ ان چیزوں کو دین سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں ہو سکتا۔ دین کی ہر بات میں وقار، متانت، فروتنی، خشیت اور پاکیزگی کی جھلک اور معرفت، حکمت، دانش اور روحانیت کی مہک ہوتی ہے۔ جس کی آنکھوں میں کچھ بصیرت اور جس کی روحانی قوت شامہ میں ذرا بھی زندگی ہو تو وہ صرف دیکھ اور سونگھ ہی کر جان جاتا ہے کہ فلاں چیز دین کی نہیں ہے۔ علمی تحقیق و کاوش کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے اور اس کے وسائل و ذرائع الگ ہیں۔ یہاں قرآن نے یہی دکھایا ہے کہ یہ مدعیان تولیت کعبہ کی نماز ہے جس کی صورت ہی گواہی دیتی ہے کہ یہ شیطان کی ایجاد ہے۔ اس میں اس نماز کی ادنیٰ جھلک بھی نہیں ہے۔ جس کے

اہتمام و قیام کے لیے یہ یہاں بسائے گئے تھے اور جس کی خاطر خدا کا یہ گھر ان کی تحویل میں دیا گیا تھا۔

مشرکانہ عبادت کے اجزاء

یہ شنکارنا، سیٹی بجانا، سنکھ بجانا، ناقوس بجانا سب ایک ہی نوع کی چیزیں ہیں، یہ چیزیں شروع سے مشرکانہ عبادت کے اجزا میں سے ہیں۔ یہ تحقیق مشکل ہے کہ ان کے پیچھے کیا تصور کارفرما رہا ہے، ممکن ہے یہ حرکتیں بھوت بھگانے کے لیے اختیار کی گئی ہوں۔ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ قریش نے سارے عرب پر اپنی مذہبی سیادت جمانے کے لیے یہ چالاکی کی تھی کہ تمام قبیلوں کے بت خانہ کعبہ اور اس کے جوار میں جمع کر دیے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ بت آئے تو ان کے ساتھ ان کی پرستش کے آداب و رسوم بھی آئے۔ بالآخر بات یہاں تک پہنچی کہ ابراہیمی نماز تو حرم سے بالکل خارج کر دی گئی، یہاں تک کہ اس کے جاننے والے بھی باقی نہیں رہ گئے، البتہ سیٹی اور تالی بجانے کی حماقتیں باقی رہ گئیں۔

قریش کو تہدید

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۔ اوپر وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ سے جو بات بصیغۂ غائب شروع ہوئی تھی، قریش کے مذکورہ جرائم گنانے کے بعد وہی بات قریش کو مخاطب کر کے کہہ دی گئی اور اس خطاب میں تہدید کے پہلو سے جو بلاغت ہے وہ واضح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خبط ذہن سے نکالو کہ تم خانہ کعبہ کے متولی اور اس کے پاسبان ہو۔ اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو۔ تمہارے کفر اور تمہاری خیانت و بدعہدی کی ایک پوری تاریخ بن چکی ہے تو اب اس کی پاداش میں خدا کا عذاب چکھو۔ اس میں اشارہ اس چپت کی طرف بھی ہے جو بدر میں ان کو لگا اور آیندہ جو طمانچے لگنے والے ہیں ان کی دھمکی بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب خدا کی مار پڑنی شروع ہوگئی ہے سکے بعد دیگرے چکھتے جاؤ اور گنتے جاؤ۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ۝ لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (۳۶-۳۷)

خدا کا انتقام بے پناہ ہے

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ الآیہ۔ اب یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ اس وقت قریش کے لیڈروں میں اسلام کے مٹانے کے لیے جو جوش و خروش ہے اور اس جوش میں وہ بڑی فیاضی سے جو اپنی دولت لٹا رہے ہیں، یہ چیز بھی اس فرقانِ حق کے نمایاں ہونے میں مانع نہ ہو سکے گی جس کا اہل ایمان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے تھی کہ فی الواقع قریش کے لیڈروں نے بدر کے موقع پر بڑی دریا دلی دکھائی تھی، جنگ کا سامان اور فوج کی رسد فراہم کرنے میں ہر سردار نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ کمزور قسم کے مسلمانوں پر یہ چیز بھی اثر انداز ہوئی کہ قریش کے پاس تعداد اور سامانِ جنگ کی کثرت بھی ہے، مال کی بہتات بھی ہے اور خرچ کرنے کے لیے جوش و خروش بھی ہے، بھلا ایسے لوگوں سے تھوڑے سے بے سروسامان مسلمان کیا مقابلہ کر

سکیں گے؛ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ راہِ حق سے روکنے کے لیے یہ زرپاشیاں جو ہو رہی ہیں ان سے مرعوب نہ ہو۔ ان خزف ریزوں اور تنکوں سے اس سیلاب کے مقابل میں بند نہیں باندھا جا سکے گا جو آ رہا ہے۔ بے شک انھوں نے بڑی فیاضی سے خرچ کیا ہے اور ابھی اور بھی یہ خرچ کریں گے لیکن ان تمام زرپاشیوں کا حاصل کفِ افسوس ملنے کے سوا اور کچھ نہ نکلے گا۔ یہ بہت جلد منہ کی کھائیں گے۔ دنیا میں ان کے لیے شکست مقدر ہو چکی ہے اور آخرت میں یہ جہنم کی طرف ہانک کے لے جائے جائیں گے۔ 'یُحْشَرُوْنَ' کے ساتھ 'اِلٰی' کے صلہ نے اس کے اندر ہانک کرلے جائے جانے کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کا لحاظ رکھا ہے۔

'لِیَمِیْزَ اللّٰهُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ الاٰیۃ' یہ اس فرقان کا بیان ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا۔ وہاں اللہ تعالیٰ سارے خبیث کو طیب سے بالکل الگ کر دے گا۔ پھر خبیث کو ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ڈھیر کر دے گا، پھر اس پورے ڈھیر کو جہنم میں جھونک دے گا۔ 'رکم' کے معنی کسی شے کو ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ڈھیر کرنے کے ہیں۔ کوڑے کرکٹ کو جلانا ہو تو اس کے لیے طریقہ یہی اختیار کیا جاتا ہے۔ سب کو جمع کر کے تہ بہ تہ ڈھیر کیا جاتا ہے پھر اس کو آگ دکھا دی جاتی ہے۔ تہ بہ تہ جمع کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آگ زیادہ مقدار میں ایندھن پا کر پورے زور سے بھڑکتی ہے اور جمع شدہ انبار کا ہر حصہ دوسرے حصہ کو جلانے میں مددگار بن جاتا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہلِ کفر جس طرح اس دنیا میں تائیدِ کفر میں ایک دوسرے کے پشت پناہ ہیں، اسی طرح جہنم میں ایک دوسرے کو جلانے کے لیے باہمدگر ایندھن کا کام دیں گے۔

'اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ' فرمایا کہ اصلی نامراد یہی ہیں۔ اس لیے کہ دنیا میں ان کا انجام یہ ہوگا کہ یہ اپنے مال برباد کریں گے، کفِ افسوس ملیں گے۔ ذلت کے ساتھ شکست کھائیں گے اور آخرت میں یہ ہوگا کہ کوڑے کرکٹ کے انبار کی طرح اکٹھا کر کے جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةَ۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ
سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۴۰﴾ (۳۸-۴۰)

قریش کو دعوتِ استغفار

'قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ' اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ قریش کو دعوتِ استغفار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اس عذاب سے بچنا چاہتے ہیں جس کی انھیں خبر دی جا رہی ہے تو وہ اس روش سے باز آئیں۔ توبہ اور اصلاح کریں، رسول کی دعوت پر لبیک کہیں۔ اگر انھوں نے اپنی روش بدل لی تو جو شرارتیں اور جو ظلم وہ اب تک کر چکے ہیں اللہ ان کو معاف کر دے گا، ان کی بنا پر وہ کسی عذاب میں نہیں پکڑے جائیں گے۔

ترغیب کے بعد ترہیب

'وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ' یہ ترغیب کے بعد ترہیب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ

باز نہ آئے، اسی طرح شرارتیں کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ وہ بھی اسی سنت الٰہی سے دوچار ہوں گے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی پچھلی قومیں دوچار ہو چکی ہیں۔ یہ اشارہ ہے عاد و ثمود، مدین اور قوم لوط وغیرہ کی طرف جن کی تاریخ تفصیل سے اعراف میں قریش کو سنائی جا چکی ہے۔ یہ بات ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں کہ جس قوم میں رسول کی بعثت ہوتی ہے اس پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے وہ قوم اگر اپنے کفر پر اڑی رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو لازماً ہلاک کر دیتا ہے۔ خواہ وہ قہر الٰہی سے ہلاک ہو یا اہل ایمان کی تلوار سے۔ رسول اتمام حجت کا سب سے بڑا بلکہ آخری ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے بعد اس کی قوم کو مہلت نہیں ملتی۔

مسلمانوں کو جہاد کا حکم

'وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ' یہ مسلمانوں کو قریش سے جنگ کرنے کا حکم ہے اور اس جنگ کے پیش نظر مقصد دو بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ فتنہ کا خاتمہ ہو جائے اور دوسرا یہ کہ دین تمام تر اللہ کا ہو جائے۔

'فتنہ' کا مفہوم

'فِتْنَة' کا لفظ جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، یہاں (PERSECUTION) کے مفہوم میں ہے۔ یعنی مسلمانوں کو بجبر و ظلم دین حق سے روکنے کا وہ سلسلہ جو قریش اور ان کے اعوان نے جاری کر رکھا تھا۔ فرمایا کہ ان سے جنگ کرو اور یہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ اس سرزمین سے اس فتنہ کا استیصال ہو جائے۔ کسی کے لیے اس کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے کہ وہ کسی مسلمان کو اسلام لانے کی بنا پر ستا سکے، عام اس سے کہ وہ امیر ہو یا غریب، آزاد ہو یا غلام۔

حرم میں دین الٰہی کا قیام

'دین' تمام تر اللہ کا ہو جائے، یعنی حرم کی سرزمین پر اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین باقی نہ رہے۔ اوپر ہم وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ بیت اللہ کی تعمیر ملت ابراہیم کے مرکز اور اس کے قبلہ کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ یہ گھر اللہ واحد کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا اور اس کی تولیت کے حق دار وہ لوگ ٹھہرائے گئے جو ملت ابراہیم کے حامل اور نماز کے قائم کرنے والے ہوں۔ قریش نے، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، اس گھر کے تمام مقاصد برباد کر کے اس کو ایک بت خانہ بنا ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی دعا کے مطابق جب اپنا آخری نبی اس قوم میں بھیجا اور اس نے لوگوں کو اصل ملت ابراہیم کی دعوت دی تو قریش کے مفاد پرست لیڈر نبی اور اس کے ساتھیوں کے دشمن ہو گئے اور ان کو اس گھر سے روک دیا حالانکہ اس گھر کی تولیت کے اصلی حق دار وہی تھے نہ کہ قریش جنھوں نے ملت ابراہیم چھوڑ کر دین شرک اختیار کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان غاصبوں اور خائنوں سے جنگ کرو اور یہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ سرزمین حرم پر اللہ کے دین یعنی اسلام کے سوا جو ابراہیم کا دین تھا کوئی اور دین باقی نہ رہ جائے۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں مؤکد فرمایا کہ اس سرزمین پر دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔ اصلاً تو یہ حکم سرزمین حرم کے لیے ہے لیکن کفر و شرک کے اثرات سے اس کی

حفاظت بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ پورا علاقہ کفر و شرک کی مداخلت سے پاک رہے جس میں حرم واقع ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جس طرح مکہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے محترم ہے اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو محترم قرار دیا جس سے اس حکم کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ اس تمام علاقے سے غیر مسلم عناصر بے دخل کر دیے جائیں جس میں حرمین واقع ہیں۔ چنانچہ اس پورے علاقے سے کفار قریش کا تسلط بھی ختم کر دیا گیا اور پھر بالتدریج یہود اور نصاریٰ بھی یہاں سے نکال دیے گئے۔

قریش کے ساتھ مسلمانوں کی نزاع کی نوعیت

اس سے معلوم ہوا کہ قریش کے ساتھ مسلمانوں کی نزاع کسی جزوی معاملے کے لیے نہیں تھی کہ وہ طے ہو جائے تو نزاع ختم ہو جائے بلکہ اصلاً اس بات کے لیے تھی کہ خانہ کعبہ روزِ اوّل سے ملت ابراہیمؑ کا مرکز ہے۔ اس ملت کے سوا کسی اور ملت کے لیے اس سرزمین پر گنجائش نہیں ہے، اس ملت کی تجدید اور بیت اللہ کی تطہیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے قریش ہی کے اندر اپنے آخری رسولؐ کو مبعوث فرمایا تاکہ اس کے ہاتھوں اللہ کا دین کامل ہو اور یہ گھر، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی تھی، تمام عالم کے لیے ہدایت و برکت کا سرچشمہ بنے۔ یہاں ان اشارات پر اکتفا فرمائیے۔ انشاء اللہ اس کی تفصیل سورۂ برأت اور سورۂ حج کی تفسیر میں آئے گی۔

'فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ'۔ اس 'انتھو' کا مفہوم بھی وہی ہے جو اوپر والی آیت کے تحت بیان ہو چکا ہے۔ یعنی اگر انھوں نے اپنی روش کی اصلاح کر لی تو اللہ تعالیٰ ان کی ماضی کی غلطیوں کو نہیں دیکھے گا بلکہ ان کے مستقبل کے اعمال کو دیکھے گا، اگر انھوں نے اخلاص کا ثبوت دیا تو اس کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کرے گا۔

مسلمانوں سے نصرت کا وعدہ

'وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ' اور اگر انھوں نے اعراض کیا، اپنی اسی ضد اور ہٹ پر جمے رہے تو تمھارا مولا و مرجع اللہ ہے۔ تم ان کی کثرتِ تعداد اور ان کے سروسامان کی بہتات سے ہراساں نہ ہو۔ خدا نے اپنی شانیں جس طرح اب تک دکھائی ہیں اسی طرح وہ اپنی شانیں آیندہ بھی دکھائے گا۔ وہ بہترین مولیٰ ہے، اپنی مشکلات میں جو اس سے رجوع کرتے ہیں وہ ان کو کبھی مایوس نہیں کرتا، وہ بہترین مددگار ہے، جن کی مدد کے لیے وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے وہ کبھی شکست نہیں کھاتے۔

۸۔ آگے کا مضمون —— آیات ۴۱-۴۹

یاد ہوگا اس سورہ کا آغاز اموالِ غنیمت سے متعلق لوگوں کے سوال سے ہوا تھا۔ وہاں سوال کا ایک اصولی جواب دے کر کلام کا رخ مسلمانوں کے ایک گروہ کی ان کمزوریوں کی اصلاح کی طرف مڑ گیا تھا جو اس سوال اور اسی نوعیت کے بعض دوسرے معاملات کی وجہ سے سامنے آئی تھیں۔ اب سوال کے تعلق سے

اموالِ غنیمت کی تقسیم کا ضابطہ بیان فرمایا اور مسلمانوں کو تاکید کی کہ اللہ کی اس تقسیم کو راضی خوشی قبول کرو اس لیے کہ جو کچھ تمھیں حاصل ہوا خدا کی تدبیر اور کارسازی سے حاصل ہوا اور آیندہ جو کچھ حاصل ہو گا اسی کی تدبیر و کارسازی سے حاصل ہو گا۔ یہ نہ خیال کرو کہ یہ سب کچھ تمھاری کارفرمائی ہوتی ہے بلکہ اصل چیز خدا کی تدبیر ہے جس کو وہ تمھارے واسطے سے بروئے کار لاتا ہے۔

اس کے بعد آیندہ پیش آنے والی جنگوں سے متعلق کچھ ہدایات دی ہیں جو جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بھی ناگزیر ہیں اور جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنے والوں کو دوسرے جنگ آزماؤں سے ممتاز بھی کرتی ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے اور اس امر کو برابر ملحوظ رکھیے کہ اس پوری سورہ میں خطاب اگرچہ بظاہر الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن مسلمانوں کے اس گروہ کی طرف خاص طور سے ہے جو ابھی اچھی طرح پختہ نہیں ہوا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ آیات
وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ ۴۱-۴۹
اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى
الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۴۱ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ
الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ۭ
وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا
كَانَ مَفْعُوْلًا ۥ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ
عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۴۲ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ
مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ
فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۴۳
وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ
فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ

ع ۵ / ۱ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ
رَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا
اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ
دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ
جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَ
قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ
ع ۶ / ۲ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ
فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾

ترجمہ آیات ۴۱ - ۴۹

اور جان رکھو کہ جو کچھ تم غنیمت حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری فیصلہ کے دن، جس دن دونوں جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۴۱

خیال کرو جب تم وادی کے قریبی کنارے پر تھے اور وہ دور کے کنارے پر اور قافلہ تم سے نیچے تھا اور اگر تم باہم میعاد ٹھہرا کر نکلتے تو میعاد پر پہنچنے میں ضرور تم مختلف

ہوجاتے لیکن اللہ نے فرق نہ ہونے دیا تاکہ اللہ اس امر کا فیصلہ فرمادے جس کا ہونا طے
ہوچکا تھا، تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے
وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے۔ بے شک اللہ سمیع وعلیم ہے۔ یاد کرو جب اللہ تیری
رویا میں ان کو کم دکھاتا ہے اور اگر زیادہ دکھا دیتا تو تم پست ہمت ہوجاتے اور معاملے میں
اختلاف کرتے لیکن اللہ نے بچا لیا، بے شک وہ دلوں کے حال سے باخبر ہے اور خیال کرو جب
کہ تمہاری مڈبھیڑ کے وقت ان کو تمہاری نظروں میں کم دکھاتا ہے اور تم کو ان کی نظروں میں
کم دکھاتا ہے تاکہ اس امر کا فیصلہ فرمادے جس کا ہونا طے شدہ تھا اور سارے معاملات
اللہ ہی طرف لوٹتے ہیں۔ ۴۲-۴۴

اے وہ جو ایمان لائے ہو، جب تمہارا کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم
رہو اور اللہ کو زیادہ یاد کرو تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت
کرو اور آپس میں اختلاف نہ کرو کہ تم پست ہمت ہوجاؤ اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے اور
ثابت قدم رہو۔ بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے اور ان لوگوں کی مانند نہ بننا
جو اپنے گھروں سے اکڑتے اور لوگوں کے آگے اپنی نمائش کرتے نکلے اور جو اللہ کی راہ سے
روکتے ہیں، حالانکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور یاد کرو
جب کہ شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیئے اور کہا کہ آج لوگوں میں کوئی
نہیں کہ تم پر غالب آسکے اور میں تمہارا پشت پناہ ہوں تو جب دونوں گروہ آمنے سامنے
ہوئے تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور بولا کہ میں تم سے بری ہوں، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں
جو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت پاداش والا ہے۔ یاد کرو

جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہتے تھے، ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا ہے اور جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں تو اللہ عزیز و حکیم ہے۔ ۴۵-۴۹

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۴۱)

'وَاعْلَمُوْا' کا محل — 'وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ' 'اِعْلَمُوْا' کا لفظ یہاں جس سیاق میں ہے اس سے اس حکم کی قطعیت اور عظمت واضح ہو رہی ہے جو یہاں بیان ہوا ہے۔ چونکہ اموالِ غنیمت سے متعلق، جیسا کہ سورہ کے شروع میں معلوم ہو چکا ہے، کچھ لوگوں نے ناروا قسم کے سوال اٹھا دیے تھے اس وجہ سے پہلے قرآن نے کمزوریوں پر تفصیل سے تبصرہ کیا، پھر جب ان کے سوال کا جواب دیا تو اس کا آغاز ایک تنبیہی کلمہ سے فرمایا کہ لوگ گوشِ ہوش سے سنیں اور بادشاہِ کائنات کے فرمان کی حیثیت سے بے چون و چرا اور بلا اختلاف و نزاع اس کی تعمیل کریں۔

اموالِ غنیمت کی حیثیت — 'غَنِمَ الشَّیْءَ' کے معنی ہیں 'اَخَذَہٗ وَنَالَہٗ بِلَا بَدَلٍ' فلاں چیز بلا کسی عوض کے حاصل کر لی۔ اسی سے 'غنیمت' ہے جس سے مراد وہ مال و اسباب ہوتا ہے جو میدانِ جنگ میں کفار سے مسلمان مجاہدین کو حاصل ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ میں حاصل شدہ مال و اسباب کو 'نفل' یا 'غنیمت' کے الفاظ سے تعبیر کر کے قرآن نے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ یہ جہاد و قتال کا کوئی معاوضہ نہیں ہے بلکہ ایک ضمنی اور زائد فائدہ ہے جو ایک مجاہد کو حاصل ہوتا ہے۔ مجاہد، اللہ کی راہ میں جو جہاد کرتا ہے وہ ایک فرض ادا کرتا ہے اور اس کا اجر اس کو اللہ کے ہاں ملنا ہے جو اس کی ابدی زندگی کے لیے محفوظ ہو گیا۔ رہی یہ چیزیں جو اسے سہرا ہے حاصل ہو جاتی ہیں تو یہ زوائد ہیں۔ حاصل ہو جائیں تو غنیمت، نہ حاصل ہوں تو نہ ان کی طمع کرے نہ غم، قرآن نے یہ تصور دے کر اس جاہلی تصور کی اصلاح کی ہے جس میں اہلِ عرب اب تک مبتلا رہے تھے کہ وہ جنگ کا اصلی حاصل لوٹ کے مال کو سمجھتے تھے اور اسی چیز سے وہ اس کے نفع و نقصان کا اندازہ لگاتے تھے۔ اس تصور کا کچھ اثر مسلمانوں کے ایک گروہ کے اندر بھی باقی تھا جو بدر کے موقع پر ظاہر ہوا اور قرآن نے اس کی اصلاح فرمائی۔ 'فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ' یہ اس مجمل جواب کی تفصیل ہے جو آیت ۱ میں 'قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ

وَالرَّسُوْلِ کے الفاظ سے دیا گیا ہے۔ وہاں ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ اجمالی جواب دے کر کہ اموالِ غنیمت کی حیثیت انفرادی ملکیت کی نہیں ہے، جیسا کہ جاہلیت میں دستور رہا ہے بلکہ اجتماعی ملکیت کی ہے، کلام کا رخ اس ذہنیت کی اصلاح کی طرف مڑ گیا تھا جس کا اظہار مسلمانوں کے ایک مخصوص گروہ کی طرف سے ہوا تھا۔ اب یہ اس اجتماعی ملکیت کی تقسیم کا طریقہ بیان فرما دیا۔

اموالِ غنیمت کی تقسیم

فرمایا کہ اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ یعنی جاہلیت کا یہ دستور کہ جو شخص جو مال و اسباب لوٹے وہ اس کا ہے، ختم ہوا۔ اب سارا مالِ غنیمت اکٹھا کیا جائے گا اور اس میں سے پانچواں حصہ اللہ و رسول کا حق نکال کر بقیہ مال مجاہدین میں تقسیم ہوگا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں سردارانِ قبائل لوٹے ہوئے مال میں سے چوتھ لیتے تھے جس کو 'مرباع' کہتے تھے، اور یہ مال ان کے ذاتی تصرف میں آتا تھا۔ اسلام نے مالِ غنیمت میں سے اللہ و رسول کا حق صرف پانچواں حصہ رکھا اور یہ بھی، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، تمام تر معاشرہ کی اجتماعی بہبود کے کاموں کے لیے معاشرہ کو لوٹا دیا۔

اللہ کا حق اور اس کا مصرف

اس پانچویں حصہ کے مصارف کی تفصیل میں سب سے پہلے اللہ کا حق بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ظاہر ہے کہ ہر چیز سے بے نیاز اور غنی ہے۔ اس کے حق کا اصلی مصرف وہ کام ہوں جو اعلائے کلمۃ اللہ، اقامتِ دین اور حفاظت و مدافعتِ ملت کی نوعیت کے ہوں گے۔ زمانہ اور حالات کی تبدیلی سے ان کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن ہر شکل میں اعلائے کلمۃ اللہ کے نصب العین کو مدنظر رکھنا لازمی ہوگا۔

رسول کا حق اور اس کی نوعیت

دوسرا حق رسول کا بتایا گیا ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات بار بار آتی ہے کہ رسول کا یہ حق بحیثیت رسول کے نہیں بلکہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے بیان ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول بھی تھے اور آپ کے ہاتھوں مدینہ منورہ میں جو اسلامی حکومت قائم ہوئی اس کے قائد و سربراہ بھی۔ جہاں تک فریضۂ رسالت کا تعلق ہے اس پر آپ کو اللہ تعالیٰ نے مامور فرمایا تھا اور قرآن میں اس بات کی تصریح ہے کہ اس نے اپنے رسول کی ساری ذمہ داریاں براہِ راست اپنے ہی اوپر لی تھیں لیکن ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے جب کہ آپ کے مبارک اوقات کا لمحہ لمحہ اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں صرف ہو رہا تھا یہ ضروری ہوا کہ اس مال میں آپ کا حق بھی رکھا جائے۔ یہ حق درحقیقت ریاست کے سربراہ کا حق تھا جو حضورؐ کے وصال کے بعد آپ سے آپ حضورؐ کے خلفا اور جانشین کی طرف منتقل ہو گیا۔

ذوی القربیٰ کا حق اور اس کی نوعیت

تیسرا حق 'ذِی الْقُرْبٰی' کا بیان ہوا ہے۔ 'ذِی الْقُرْبٰی' سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار مراد ہیں اور قرابت دار بھی ظاہر ہے کہ وہ قرابت دار ہوں گے جن کی کفالت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ عام اس سے کہ یہ ذمہ داری عرفی و شرعی نوعیت کی ہو یا اخلاقی نوعیت کی جو ہر کریم النفس سربراہ خاندان پر خاندان کے غریبوں، محتاجوں اور معذوروں کے متعلق اخلاقاً عائد

ہوتی ہے۔ یہ بات اس وسعت و عمومیت سے نکلتی ہے جو ذوی القربیٰ کے لفظ میں ہے اور یہ بات بھی نکلتی ہے کہ 'ذِی الْقُرْبٰی' کا یہ حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی قائم رہنے والا تھا۔ اگر یہ آپ کی حیاتِ مبارک ہی تک محدود ہوتا تو اس کے مستقل ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

یتیموں اور مسکینوں کا حق اور اس کی نوعیت

پانچواں حق یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے۔ ان کا حق بیان کرتے ہوئے اس 'ل' کا اعادہ نہیں فرمایا جو اوپر 'اللہ'، 'رسول' اور 'ذوی القربیٰ' تینوں کے ساتھ الگ الگ لگا ہوا ہے بلکہ ان کا ذکر ذِی الْقُرْبٰی کے تحت ہی کر دیا ہے۔ اس سے مقصود اس طبقہ کی تشریف اور عزت افزائی ہے کہ گویا یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربیٰ ہی کے تحت ہیں۔ جو لوگ اسلامی نظام کے مزاج سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ یتیموں اور مسکینوں کی حیثیت ایک صحیح اسلامی نظام میں سربراہ ریاست کے کنبے کی ہے۔ سربراہ حکومت کو جس طرح اپنے کنبہ کی فکر کرنی پڑتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کو یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل اس کی ناقابلِ تردید اور زندۂ جاوید شہادت ہے۔ حضرت عمرؓ نے تو کہیں فرمایا بھی ہے کہ ریاست کے مال میں سے میرا حق بس اتنا ہی ہے جتنا ایک یتیم کے متولی کا حق یتیم کے مال میں سے ہے۔ اس حقیقت کا بھی انھوں نے بار بار اظہار فرمایا کہ مملکت کے ہر یتیم و مسکین اور مسافر کی ذمہ داری براہِ راست مجھ پر ہے۔ جس مملکت میں یتیم دھکے کھائیں، مسکین بھوکے سوئیں، مسافر کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو اس مملکت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے خواہ وہ اسلام کے کتنے ہی بلند بانگ دعاوی کرے۔

غربا و فقراء کے اموال کا اجتماعی مقصد

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جو لوگ 'ل' کو لام تملیک کے معنی میں لے کر غربا، فقرا، یتامیٰ اور مساکین کی اجتماعی بہبود کے کاموں پر ان کے حصہ کے مال کو خرچ کرنے سے روکتے ہیں، ان کی بات عربیت کے پہلو سے کچھ زیادہ وزن دار نہیں ہے۔ حرفِ 'ل' عربی میں تملیک ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ متعدد معانی کے لیے آتا ہے جن میں سے ایک معروف مفہوم نفع رسانی اور بہبود کا بھی ہے۔ ہم نے اس پر مفصل بحث اپنے ایک مستقل مقالے میں کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بالکل جائز ہے کہ اسلامی حکومت جن کاموں کو غربا اور فقرا کی اجتماعی بہبود کے نقطۂ نظر سے مفید پائے ان پر بھی ان کے حصہ کی رقوم جو اس کی تحویل میں آئیں، خرچ کرے۔ انفرادی تملیک ہر حال میں لازمی نہیں ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ۔

غزوہ بدر جانچ کی کسوٹی

'یَوْمَ الْفُرْقَانِ' سے مراد غزوۂ بدر کا دن ہے۔ 'یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ' کے الفاظ سے اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔ اس لیے کہ وہی پہلا دن تھا جب مسلمانوں اور کفار کے درمیان جماعتی حیثیت سے تصادم ہوا ہے۔ غزوۂ بدر کو 'یوم الفرقان' سے تعبیر کرنے کی وجہ کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ قریش کے لیڈروں نے خود اس جنگ کو ایک کسوٹی کی حیثیت دے دی تھی کہ جو اس جنگ میں ہارا وہ باطل پر سمجھا

جائے گا، جو جیسا وہ حق پر مانا جائے گا۔ اس طرح خود انہی کی انتخاب کردہ کسوٹی نے حق و باطل کا فیصلہ کر دیا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ اس جنگ میں تائیدِ الٰہی گوناگوں شکلوں میں اس طرح بے نقاب ہوئی کہ گویا ہر شخص نے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حق کس کے ساتھ ہے اور خدا کس کے پہلو پر ہے۔ وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا سے اسی نصرتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔

یہ ٹکڑا اوپر والے مضمون ہی کو مؤکد کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تقسیمِ غنیمت کے باب میں یہ حکم جو تمھیں دیا ہے بے چون وچرا اس کی تعمیل کرو، اگر اللہ پر اور اس نصرتِ الٰہی پر تمھارا ایمان ہے جو ہم نے حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والی جنگ میں اپنے بندوں پر اتاری۔ چونکہ روئے سخن ان نکتہ چینوں کی طرف خاص طور سے ہے جنھوں نے اموالِ غنیمت سے متعلق سوال اٹھائے تھے، اس وجہ سے فرمایا کہ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس قسم کے سوالات غمازی کرتے ہیں کہ ابھی تمھارے اندر ایمان راسخ نہیں ہوا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یوں نہیں فرمایا کہ اگر تم اس نصرتِ الٰہی پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے تم پر اتاری بلکہ یوں فرمایا کہ اپنے بندے پر اتاری' جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ کسی گروہ کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ کامیابی جو حاصل ہوئی ہے یہ اس کا کارنامہ ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے اللہ کی کارسازی اور اس رسول کی برکت سے ہوا ہے جس کی مدد کے لیے اللہ نے اپنی غیبی فوج بھیجی۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ نہ اللہ کسی کا محتاج ہے اور نہ اس کا رسول کسی کا دست نگر ہے۔ اللہ جب چاہے گا اپنے رسول کی مدد کے لیے اپنی افواجِ قاہرہ بھیج دے گا۔

اِذۡ اَنۡتُمۡ بِالۡعُدۡوَۃِ الدُّنۡیَا وَہُمۡ بِالۡعُدۡوَۃِ الۡقُصۡوٰی وَالرَّکۡبُ اَسۡفَلَ مِنۡکُمۡ ؕ وَلَوۡ تَوَاعَدۡتُّمۡ لَاخۡتَلَفۡتُمۡ فِی الۡمِیۡعٰدِ ۙ وَلٰکِنۡ لِّیَقۡضِیَ اللّٰہُ اَمۡرًا کَانَ مَفۡعُوۡلًا ۬ۙ لِّیَہۡلِکَ مَنۡ ہَلَکَ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ وَّیَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ لَسَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ (۴۲)

غزوۂ بدر میں خدا کی کارسازی

یہ اللہ تعالیٰ کی اس تدبیر و کارسازی کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہوا ہے کہ کس طرح اللہ نے تم کو ٹھیک وقت پر دشمن کے مقابلے کے لیے محاذِ جنگ پر پہنچا دیا کہ وادی کے ایک سرے پر تم پہنچے، دوسرے سرے پر قریش تھے اور تجارتی قافلہ نیچے ساحلِ سمندر کی طرف سے گزر رہا تھا۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی فوج اور قافلہ کی آمد کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے رویا میں دکھا دیا تھا۔ اسی رویا کی رہنمائی کے مطابق آپ مدینہ سے نکلے اور ٹھیک اس وقت آپ وادی بدر میں پہنچ گئے جب قریش کی فوج قافلہ کی حفاظت کے بہانے وادی کے دوسرے کنارے پر پہنچی۔ فوج کا دشمن کے مقابلہ کے لیے ٹھیک وقت پر اپنے موقع و محل پر پہنچ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ جنگ کا بہت کچھ انحصار اسی پر ہوتا ہے۔ معمولی تاخیر بھی بسا اوقات شکست کے مترادف بن جاتی ہے۔ پھر وقت سے بہت پہلے پہنچنا بھی خطرات اور نقصانات سے خالی

نہیں، اور کچھ نہیں تو مسلمانوں کے لیے رسد کا مسئلہ ہی بڑا مشکل تھا بالخصوص اس زمانے میں جب کہ مسلمان نہتے بھی تھے اور نہایت غریب بھی۔ فریقین اس معاملے میں چالیں بھی بہت سی چلتے ہیں جس سے ان کا مقصود ایک دوسرے کو دھوکہ دینا ہوتا ہے۔ منصوبے کچھ ہوتے ہیں، اعلانِ جنگ اور الٹی میٹم میں ظاہر کچھ کیے جاتے ہیں۔ نشانہ کوئی ہوتا ہے، اشارہ کسی طرف کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس قسم کی تمام چالوں سے محفوظ رکھا اور خاص اپنی رہنمائی میں، ٹھیک وقت پر دشمن کے مقابلہ کے لیے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں ان کا پہنچنا ضروری تھا۔ فرمایا کہ یہ حسنِ اتفاق خداساز تھا۔ اگر تم ایک دوسرے کو اعلان اور الٹی میٹم دے کر نکلتے تو یہ اجتماع اس شکل میں آسان نہ ہوتا۔

'وَلٰکِنۡ لِّیَقۡضِیَ اللّٰہُ اَمۡرًا کَانَ مَفۡعُوۡلًا'۔ 'لِیَقۡضِیَ' سے پہلے فعل محذوف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی تدبیر و کارسازی سے تم کو اور تمہارے دشمنوں کو اس طرح ایک دوسرے کے آمنے سامنے اس لیے لا کھڑا کیا کہ وہ بات واقع ہو جائے جس کا واقع ہونا اس کی اسکیم میں طے پا چکا تھا۔

خدا کی اسکیم کے فوائد و مصالح

'لِّیَہۡلِکَ مَنۡ ہَلَکَ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ وَّیَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ' یہ وضاحت ہو رہی ہے خدا کی اسکیم اور اس کے فوائد و مصالح کی۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے چاہا کہ قریش اور مسلمانوں میں ایک ٹکر ہو اور وہ فرقان نمایاں ہو جائے جو حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح کر دے تاکہ اس کے بعد جو ہلاکت کی راہ اختیار کریں وہ بھی اتمامِ حجت کے ساتھ یہ راہ اختیار کریں، جو زندگی کی راہ اختیار کریں وہ بھی ایک روشن دلیل دیکھ کر اختیار کریں۔ ہلاکت اور زندگی سے مراد، ظاہر ہے کہ یہاں روحانی و معنوی ہلاکت اور زندگی ہے۔ حرف 'عن' عربی میں کسی چیز کے منبع و مصدر اور مولد و منشا کا بھی سراغ دیتا ہے۔ بدر کے معرکہ نے اہلِ کفر اور اہلِ ایمان دونوں گروہوں کے سامنے ایک ایسی واضح برہان رکھ دی کہ نہ اہلِ کفر کے لیے کوئی عذر باقی رہ گیا نہ اہلِ ایمان کے لیے کوئی ابہام۔ ان کے لیے ان کا کفر بالکل عریاں ہو کر سامنے آ گیا اور اہلِ ایمان کے لیے ان کا ایمان سورج کی طرح چمک اٹھا۔

'وَاِنَّ اللّٰہَ لَسَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ' ان صفات کا حوالہ اس پوری اسکیم کے تعلق سے یہاں آیا ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ کہاں تم، کہاں قریش اور کہاں قافلہ لیکن اللہ تعالیٰ نے سب کے بھید معلوم کر لیے، سب کی سرگوشیاں سن لیں اور سب کے ارادے تاڑ لیے اور پھر سب کو اس طرح جمع کر کے وہ بات پوری کر کے دکھا دی جو اس نے طے کر لی تھی اس لیے کہ وہ سمیع و علیم ہے۔

اِذۡ یُرِیۡکَہُمُ اللّٰہُ فِیۡ مَنَامِکَ قَلِیۡلًا ؕ وَلَوۡ اَرٰىکَہُمۡ کَثِیۡرًا لَّفَشِلۡتُمۡ وَلَتَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ سَلَّمَ ؕ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ (۴۳)

پیغمبرؐ کو رویا میں صورت حال کا مشاہدہ

یہ دوسری مثال بیان ہو رہی ہے اللہ تعالیٰ کی کارسازی کی کہ اس نے پیغمبر کو رویا میں کفار کی فوج کی تعداد تھوڑی دکھائی اور پیغمبرؐ نے ایک قلیل التعداد جماعت ہی کی حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے اس

کا ذکر بھی کیا، بلکہ جیسا کہ آیت ، میں گزر چکا ہے یہ بھی خوش خبری دے دی کہ یہ قلیل التعداد گروہ مسلمانوں سے مغلوب ہو جائے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے کیا کہ اگر ان کو کثیر تعداد میں دکھایا جاتا، جتنے کہ وہ فی الواقع تھے تو پیغمبر لازماً اسی شکل میں مسلمانوں سے ان کا ذکر بھی کرتے جس کا اثر کمزور مسلمانوں پر یہ پڑتا کہ وہ ہمت ہار بیٹھتے اور جنگ کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں مختلف الرائے ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ دلوں کی کمزوریوں سے اچھی طرح باخبر ہے اس وجہ سے اس نے یہ تدبیر اختیار فرمائی تاکہ مسلمانوں کا حوصلہ قائم رہے اور وہ کسی کمزوری کے اظہار سے محفوظ رہیں۔

ایک غلط خیال کی تردید

بعض لوگوں نے یہاں سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کبھی کبھی حضرات انبیاء کو بھی رویا میں کوئی چیز خلاف واقعہ دکھا دی جاتی ہے۔ چنانچہ قریش کی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ تھوڑی دکھائی گئی۔ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔ رویا وحی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اس وجہ سے پیغمبر کی رویا خلاف واقعہ نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ہوتا ہے کہ رویا میں کبھی کوئی حقیقت مجاز کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی کسی شے کے ظاہر کے بجائے اس کی معنوی حقیقت کسی پیرایہ میں دکھائی جاتی ہے۔ یہاں یہی صورت حال ہے۔ کفار کی فوج تعداد میں ہر چند بہت زیادہ تھی لیکن معنوی اور اخلاقی اعتبار سے اس کی حیثیت بہت کم تھی۔ ان کی یہی معنوی قلت رویا میں قلت تعداد کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ رویا کا یہی پہلو ہے جس کے سبب سے اس میں تاویل کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس کی تاویل میں کبھی کبھی خود نبی کو بھی، وقتی طور پر، کوئی تردد پیش آجاتا ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ نبی کی رویا کبھی کبھی خلاف واقعہ ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ قرآن نے 'قلیل' کا لفظ بہت جنچا تلا استعمال کیا ہے عربی میں لفظ 'قلیل' صرف عددی اور مقداری اعتبار ہی سے قلیل کے لیے نہیں آتا بلکہ معنوی اعتبار سے بے وزن وبے حقیقت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کسی حماسی کا یہ شعر بہت معروف ہے۔

فان اَکُ فی شرارکم قلیلا فانی فی خیارکم کثیر

(اگر میں تمھارے اشرار کی نگاہوں میں کم رتبہ ہوں تو کچھ غم نہیں۔ تمھارے اخیار کی نگاہوں میں میرا بڑا رتبہ ہے)

یہاں ہم اس اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔ کسی مناسب مقام پر ہم 'رویا' پر ان شاء اللہ مفصل بحث کریں گے۔

خطاب کی ایک خاص نوعیت

'فَشِلْتُمْ' اور 'تَنَازَعْتُمْ' میں خطاب اگرچہ عام ہے لیکن اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ یہ مسلمانوں کے پورے گروہ سے متعلق ہے بلکہ یہ قرآن کے معروف اسلوب بیان کے مطابق عام الفاظ میں مسلمانوں کے اس مخصوص گروہ کے کردار کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر سورہ کے آغاز سے چلا آ رہا ہے۔ آیت ، کے تحت جس گروہ کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ یہ جانتے بوجھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نکلنا قریش کی فوج کے مقابلہ

کے لیے ہے، وہ کوشش کرتا رہا کہ آپ قافلہ کا رخ کریں اور آنحضرتؐ کی طرف سے اس بشارت کے باوجود کہ جس سے مقابلہ ہونا ہے وہ ہم سے شکست کھائے گا، وہ اس طرح لرزہ براندام رہا کہ گویا اسے موت کے منہ میں لے جایا جا رہا ہے۔ اسی گروہ کی طرف کلام کا رخ یہاں بھی ہے۔ جن کے حوصلہ کا یہ حال ہو، ظاہر ہے کہ اگر وہ پہلے سے کہیں یہ سن پاتے کہ مقابلہ لشکر سے ہے اور وہ بھی ایک کثیر التعداد لشکر سے تو ان کے تو دل ہی بیٹھ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں لوگوں کی رعایت سے دشمن کی فوج کی عددی حیثیت کی بجائے اس کی معنوی حیثیت ان کے سامنے رکھی۔

اس امر پر بھی یہاں نگاہ رہے کہ 'یُرِیکَ'، 'مَنَامِکَ'، 'اَرٰکَ'، سب میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لیے ہے کہ رؤیا میں جو کچھ دکھایا گیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دکھایا گیا۔ نبی اہل ایمان کے لیے بمنزلۂ دل اور آنکھ کے ہوتا ہے اس وجہ سے دیکھتا تو وہی ہے لیکن وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس کا تعلق سب سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جہاں تک دیکھنے کا تعلق ہے اس کو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی تک محدود رکھا ہے لیکن اس کے ردعمل کے ذکر میں تمام مسلمانوں کو شامل کر لیا ہے۔

اِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (۴۴)

اللہ تعالیٰ کی ایک اور کارسازی

یہ اللہ تعالیٰ اسی سلسلہ کی اپنی ایک اور کارسازی بیان فرما رہا ہے کہ جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل میں ہوئیں تو ابتدائی مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نظروں میں کفار کے لشکر کو کم کر کے دکھایا اور کفار کی نظروں میں مسلمانوں کو کم کر کے دکھایا تاکہ دونوں میں سے کوئی فریق بھی ٹکر لینے میں خوف نہ کھائے اور وہ معرکہ ہو کے رہے جو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دے اور جس کا واقع ہونا اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں طے ہو چکا ہے۔

کفار کی نگاہوں میں مسلمانوں کا کم نظر آنا تو اس لیے تھا کہ ان کی ظاہر بین آنکھوں کو مسلمانوں کی صرف عددی حیثیت نظر آئی، اس کی معنوی و اخلاقی قوت و حیثیت ان کی نگاہوں سے اوجھل رہی۔ حالانکہ یہی قلیل التعداد فوج بعد کے مرحلہ میں، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، معرکہ کارزار گرم ہو جانے کے بعد، ان کو ایک طوفان کی شکل میں نظر آئی اس لیے کہ اس وقت مسلمانوں کی معنوی و روحانی حیثیت پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آ گئی۔

جنگ کے دوران کی ایک نفسیاتی حقیقت

مسلمانوں کی نگاہوں میں کفار کے ان کی عددی اکثریت کے باوجود کم نظر آنے کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ان کی معنوی و اخلاقی حیثیت بے نقاب کر دی۔ نگاہ بہت بڑی حد تک دل کے تابع ہوتی ہے۔ اگر دل میں حوصلہ اور امنگ ہو، ایمان و اعتماد ہو، جزم و یقین ہو، مقصد کی صداقت اور اس کے لیے مر مٹنے کا جذبہ صادق ہو تو سامنے پہاڑ بھی ہو تو ایک تودۂ ریگ کی شکل میں نظر آتا ہے اور اگر دل ان چیزوں سے

خالی ہو تو آدمی گلہری کو پہاڑ اور بکری کو شیر سمجھنے لگتا ہے۔ آدمی سے زیادہ طاقت ور اور آدمی سے زیادہ ناتواں، کوئی بھی نہیں ہے اور اس طاقت اور ناتوانی دونوں کا سرچشمہ خارج میں نہیں بلکہ اس کے باطن ہی میں ہے۔ مادیت کے اس دور میں لوگوں کو یہ باور کرانا آسان نہیں کہ سو مسلمان اپنے آپ کو کسی زمانہ میں ہزار کفار پر بھاری سمجھتے تھے لیکن ہے یہ واقعہ اور تاریخ اس پر شاہد ہے اور آج بھی ہر شخص اس کا تجربہ کر سکتا ہے اگر وہ ایمان کی حلاوت سے آشنا ہو جائے۔

وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سررشتہ سارے معاملات کا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کم دکھانا اور زیادہ دکھانا، جتانا اور ہرانا، بڑھانا یا گھٹانا جو کچھ بھی ہوتا ہے اصلاً خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے، باقی سب خدا پر چھوڑے۔ اس غلط فہمی میں کبھی مبتلا نہ ہو کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر بھی کچھ بنا یا بگاڑ سکتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (۴۵-۴۶)

جنگ کے باب میں مومنین کو ہدایات

یہ آگے کے مراحل کے لیے ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب تمہارا کفار کے کسی گروہ سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ۔ ثابت قدمی اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی نصرت ہمیشہ اسباب کے پردے سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دنیا بندوں کے لیے امتحان گاہ ہے۔ جب بندے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہیں تو اس کے پردے میں اللہ کی نصرت ظاہر ہوتی ہے۔ بندوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی طرح خدا کا امتحان کریں کہ خود تو گھروں میں بیٹھے رہیں اور خدا سے یہ امید کریں کہ وہ فتح کر کے کنجیاں ان کے حوالے کر دے، تب وہ شہر میں داخل ہوں گے۔

ثابت قدمی کا ذریعہ اللہ کی یاد ہے

اللہ کا ذکر ثابت قدمی کا ذریعہ ہے۔ اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اصل قوت دل کی قوت ہے اور دل کو قوت ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایمان سرسبز و شاداب، ذکر الٰہی کی جھڑی سے رہتا ہے۔ یہ ذکر الٰہی یوں تو سانس کی طرح ہر وقت ایمانی زندگی کے لیے ضروری ہے اس لیے کہ انسان ہر وقت شیطان سے نبرد آزما ہے لیکن حالات زیادہ صبر آزما ہوں تو یہ ذکر بھی زیادہ مقدار میں مطلوب ہوگا۔ اسی وجہ سے یہاں کثیرًا کی قید لگی ہوئی ہے۔

حصول فلاح کا ذریعہ

لفظ 'فلاح'، ایک جامع لفظ ہے۔ یہ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی پر مشتمل ہے۔ مجرد غلبہ تو ہو سکتا ہے کہ بغیر ذکر الٰہی کے بھی حاصل ہو جائے لیکن وہ فلاح کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ فلاح اسی غلبہ سے حاصل ہوگی جس کا دروازہ ذکر الٰہی کی مدد سے کھلے اور جس میں غلبہ حاصل کرنے والوں کو خدا کی معیت حاصل ہو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کسی فوج کی ثابت قدمی میں اصلی عامل کی حیثیت ہمیشہ اس کے حوصلہ ہی کو حاصل ہوتی

ہے۔ اس چیز کی اہمیت جس طرح پہلے تسلیم کی گئی ہے اسی طرح آج بھی تسلیم کی جاتی ہے۔ اسلام نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے حوصلہ برقرار رکھنے کا ذریعہ ذکرِ الٰہی کو بتایا ہے اور حق یہ ہے کہ مومن کے اندر عزم اور حوصلہ کا سرچشمہ یہی چیز ہے۔

اطاعتِ اللہ و رسول کا ایک خاص مفہوم

'وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ' یہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کے عام مفہوم کے سوا اس کا ایک خاص مفہوم بھی پیشِ نظر ہے۔ یعنی دشمن کے مقابل میں کامل نظم اور کامل ڈسپلن کا ثبوت دو۔ جو حکم اللہ نے دیے ہیں ان کی بھی پوری اطاعت کرو اور جو حکم رسول دے اس کی بھی بے چون و چرا تعمیل کرو۔ جس طرح دل ذکرِ الٰہی سے محروم ہو تو اس میں انتشار برپا ہو جاتا ہے اسی طرح جماعت اگر اطاعت میں ڈھیلی ہو تو جماعت کا نظم درہم برہم ہو جاتا ہے اور پھر اس کی ہوا اکھڑ جاتی ہے۔

نظم اور ڈسپلن کی پابندی

'وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ' اسی بات کو منفی پہلو سے واضح فرمایا کہ اللہ و رسول کے دیے ہوئے احکام سے اختلاف نہ کرنا ورنہ جماعت میں انتشار برپا ہوگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ یہی وہ ہدایت ہے جس کی غزوۂ احد کے موقع پر ایک جماعت نے خلاف ورزی کی اور اس کا تلخ نتیجہ پوری جماعت کو بھگتنا پڑا۔ قرآن نے آلِ عمران میں اسی کا حوالہ دیا ہے۔ حَتّٰٓی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىکُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۱۵۲ (یہاں تک کہ جب تم حوصلہ ہار بیٹھے اور تم نے نبی کے حکم میں اختلاف کیا اور تم نے نافرمانی کی بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھا دی تھی جس کو تم عزیز رکھتے تھے)

خدا کی معیت حاصل ہونے کی شرط

'وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ' وہی بات جو اوپر 'فَاثْبُتُوْا' کے لفظ سے فرمائی ہے یہاں 'وَاصْبِرُوْا' کے لفظ سے فرمائی ہے۔ البتہ اوپر والی بات افراد کو پیشِ نظر رکھ کر فرمائی گئی ہے اور یہ جماعت کو پیشِ نظر رکھ کر ارشاد ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی مدد و نصرت اور اس کی معیت کے طالب ہو تو اپنے جماعتی کردار سے اس کا استحقاق پیدا کرو۔ خدا منتشر بھیڑ کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ ان لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو اس کی راہ میں جہاد کے لیے بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہوں۔

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط وَاللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ۝ وَاِذْ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ ج فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ ط وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ (۴۷-۴۸)

(وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)

'بَطَر' کا مفہوم

'بطر' کے معنی حق سے اکڑنے اور اس سے متکبرانہ منہ موڑنے کے ہیں۔ قرآن نے اس سے اس بدمستی اور سرکشی کو تعبیر فرمایا ہے جو اللہ کی نعمتیں پا کر کسی شخص یا گروہ پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ شکر اور

تواضع کے بجائے غرور اور طغیان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۵۸ (اور کتنی بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جو اپنے وسائل معیشت کی فراوانی پر اکڑنے لگی تھیں)

یہ قرآن نے اس روش کے منافی روش سے مسلمانوں کو روکا ہے جس کی تعلیم اوپر والی آیت میں وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا کے الفاظ سے دی ہے۔ 'كَالَّذِيْنَ' سے اشارہ قریش کی طرف ہے جو جنگ بدر کے لیے، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، اپنی کثرت تعداد اور اسباب و وسائل کی بہتات کے گھمنڈ میں بڑے طنطنہ اور بڑے طمطراق سے نکلے تھے۔ فرمایا کہ کسی مرحلے میں بھی ان لوگوں کی روش تم نہ اختیار کرنا۔ تم خدا کی بندگی و اطاعت کی رسم دنیا میں قائم کرنے اٹھے ہو تو بندگی کی تواضع اور عبدیت کی فروتنی ہر جگہ تم پر نمایاں رہے۔ خواہ بزم میں ہو یا رزم میں۔ اگرچہ مقصود یہاں مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ تمہاری جنگ جنگ نہیں بلکہ خدا کی عبادت ہے، اس کی شان عبادت ہر جگہ قائم رہے لیکن اس سے یہ بات بھی سامنے آگئی کہ آئندہ مسلمانوں کے سامنے ایسے حالات آنے والے ہیں کہ اگر وہ چوکنے نہ رہے تو وہ بھی اس قسم کے فتنوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ گویا یہ ایک بشارت بھی ہے اور ساتھ ہی تنبیہ بھی کہ ہمیشہ خدا ہی سے وابستہ رہنا، تعداد اور سامان کی فراوانی جب حاصل ہو جائے تو اس کے غرے میں اترانے نہ لگنا۔ اصل چیز سروسامان نہیں بلکہ خدا کی کارسازی اور اس کی معیت ہے۔

اہل ایمان کی جنگ بھی عبادت ہے

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح 'وَلَا تَنَازَعُوْا' کی ہدایت کی ایک گروہ نے خلاف ورزی کر کے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، جنگ احد میں پوری جماعت کے لیے ایک سخت آزمائش پیدا کر دی، اسی طرح جنگ حنین کے موقع پر کثرت تعداد کے اعتماد نے مسلمانوں کو ایک سخت آزمائش سے دوچار کر دیا جس کی طرف قرآن نے یوں اشارہ فرمایا ہے وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۲۵۔ توبہ (اور حنین کے دن جب کہ تمہاری کثرت نے تمہیں غرور میں مبتلا کیا تو وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ پیچھے بھاگے)

ریا اور نمائش سے احتراز کی ہدایت

'رِئَآءَ النَّاسِ' سے قریش کے اس جذبۂ نمائش کی طرف اشارہ ہے جس سے ایک ایک سردار بدر کے موقع پر سرشار تھا۔ اس کا ضد اللہ کے لیے اخلاص ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو کچھ کرنا ہمیشہ اللہ کے لیے کرنا اس لیے کہ تمہیں اپنے کسی عمل کی داد دنیا سے نہیں لینی ہے بلکہ آخرت میں اپنے رب سے لینی ہے۔

وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ لیعنی ان کا یہ سارا طمطراق اور سارا جوش و خروش اس لیے تھا کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی راہ سے روکیں۔ ان نادانوں کو پتہ نہیں کہ انسان خواہ کتنی وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ اپنے جال پھیلائے اور اپنی ترکتازیوں کے کتنے ہی مظاہرے دکھائے، اس کی ہر چیز ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہے۔ اس کی ساری جولانیوں کے اردگرد خدا نے باڑ لگا رکھی ہے

وَاِذْ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ الآیۃ۔ یعنی قریش کے اس بطر و ریا کے مظاہرے میں تعداد اور وسائل کی کثرت کو تو دخل تھا ہی، شیطان نے بھی جس کو اللہ کی راہ مارنے کے کام ہی کے لیے مہلت ملی ہوئی ہے، ان کو پٹی پڑھائی کہ شاباش، آگے بڑھو، بھلا آج کس میں دم ہے کہ تمھارا مقابلہ کر سکے، میں تمھارا ساتھی اور مددگار ہوں لیکن وہ اس وقت تک تو ان کی پیٹھ ٹھونکتا رہا جب تک دونوں فوجیں آمنے سامنے نہیں ہوئیں لیکن جب فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو وہ دم دبا کر پیچھے کھسک گیا کہ میں تم سے بری، میں کچھ اور دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو، مجھے اللہ سے ڈر لگتا ہے۔

جنگ بدر میں یہود کی ریشہ دوانیاں

شیطان کے متعلق ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی یہاں ہمارا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ اس سے اشارہ یہود کی طرف ہے۔ سیرت و مغازی کی کتابوں سے بھی اور قرآن کے اشارات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہود شروع ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے خائف تھے۔ ابھی آپ مکہ ہی میں تھے کہ انھوں نے طرح طرح سے آپ کے خلاف قریش کو اکسانا شروع کر دیا، مدینہ ہجرت فرمانے اور آپ کو انصار کی حمایت حاصل ہو جانے کے بعد تو خاص طور پر انھوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ان کے سینہ پر پتھر کی ایک بھاری سل رکھ دی گئی ہے۔ مستقبل کے سیاسی اندیشوں کے علاوہ وہ خود اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر بھی ڈرتے تھے کہ مبادا یہ وہی پیغمبر ہوں جس کا ذکر ان کے ہاں پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ وہ اپنی قوم سے باہر کسی نبوت و رسالت کو تسلیم کرنے کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھے لیکن اپنی بزدلی کے سبب سے وہ آپ کے خلاف براہ راست کوئی اقدام کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ درپردہ وہ قریش کے لیڈروں کو بھی برابر اکساتے رہے اور مدینہ میں اوس و خزرج کے اندر بھی سازباز کرتے رہے۔ ایسے حالات میں یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ قریش نے قافلہ کی حفاظت کے بہانے جب مدینہ پر حملہ کی اسکیم بنائی تو اس میں یہود کا مشورہ بھی شامل رہا ہو اور انھوں نے قریش کو ورغلایا ہو کہ اول تو تمھاری بھاری جمعیت خود ہی مٹھی بھر مسلمانوں کو کچل دینے کے لیے کافی ہے لیکن ضرورت ہوئی تو ہم بھی تمھاری مدد کو حاضر ہیں۔ اگرچہ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک معاہدے میں بھی شریک تھے لیکن آگے اسی سورہ کی آیات ۵۶ - ۵۷ کے تحت یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انھوں نے اس کا کبھی پاس و لحاظ نہیں رکھا بلکہ برابر ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے۔ البتہ اپنی روایتی بزدلی کے سبب سے انھوں نے سامنے آنے کی جرأت کبھی نہیں کی۔ اس موقع پر بھی انھوں نے قریش کو بڑھاوے تو بہت دیے لیکن جب دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابل میں آ گئے اور انھوں نے مسلمانوں کے حوصلہ کو دیکھا تو دم سادھ کر بیٹھ رہے۔ اس موقع پر ان کے اندر سمایا ہوا وہ خوف بھی نمایاں ہوا ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے متعلق وہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے اور جن کی نسبت ان کے صحیفوں کے ذریعے سے ان کے کانوں میں یہ بات پڑی ہوئی تھی

کہ ان کے جلو میں ملائکہ اور کروبیوں کی فوجیں ہوں گی۔ وہ بات بھی یہاں یاد رکھیے جس کا ذکر ہم سورۂ بقرہ میں کر آئے ہیں کہ بدر کی لڑائی، اپنے نقشۂ جنگ، اپنی تعداد اور مقصد کے اعتبار سے بنی اسرائیل کی اس جنگ سے مشابہ تھی جو سموئیل نبی کے عہد میں، طالوت کی زیر قیادت جالوت سے لڑی گئی تھی۔

منافقین کی زیرکاریاں

قرآن نے یہاں جو تمثیل یہود کی دی ہے بعینہٖ یہی تمثیل ان منافقین کے لیے بھی استعمال کی ہے جو یہود ہی کے اندر کے تھے بھی اور مسلمانوں کے اندر گھس کر یہود سے ساز باز بھی رکھتے تھے۔ یہ ان کو اطمینان دلاتے تھے کہ اگر مسلمانوں نے ان کے خلاف کوئی اقدام کیا تو وہ مسلمانوں کے بجائے ان کا ساتھ دیں گے لیکن قرآن نے واضح کیا کہ یہ ویسا ہی فریب ہے جیسا شیطان ان لوگوں کو دیا کرتا ہے جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ چونکہ ان دونوں تمثیلات میں بڑی مشابہت ہے اس وجہ سے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں زیر بحث تمثیل اچھی طرح واضح ہو جائے۔ سورۂ حشر میں منافقین کے ایک گروہ کا، جو یہود میں سے تھا، یہ کردار بیان ہوا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ - ۱۱-۱۲ حشر

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو منافق ہیں، وہ اپنے ان بھائیوں سے جنھوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا، کہتے ہیں کہ اگر تم نکالے گئے تو ہم بھی تمھارے ساتھ نکلیں گے اور تمھارے بارے میں ہم کسی کی بھی کوئی بات نہیں مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمھاری مدد کریں گے۔ اللہ شاہد ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ ہوئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے۔ اور اگر مدد کریں گے تو منہ کی کھائیں گے۔ پھر ان کی مدد کہیں سے نہیں ہوگی۔

پھر ان منافقین کی تمثیل ان الفاظ میں دی ہے۔

كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِنْكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۝ (۱۶-۱۷ حشر)

ان منافقین کی مثال شیطان کی ہے جو انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر پھر جب وہ کفر کر بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں۔ میں اللہ، عالم کے خداوند سے ڈرتا ہوں۔ تو ان دونوں کا انجام یہ ہے کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔

جس طرح یہاں یہودی منافقین کی تمثیل شیطان سے دی ہے اسی طرح زیر بحث آیت میں اگرچہ ذکر

شیطان کا ہے لیکن اشارہ یہود کی طرف ہے۔ تمثیل کے بجائے اشارہ وکنایہ کی صورت اس لیے اختیار فرمائی کہ یہود کی یہ ساری کارستانیاں ابھی پردے میں تھیں اس وجہ سے قرآن نے بھی یہ چاہا کہ ابھی بات پردے ہی میں رہے لیکن اشاروں کنایوں میں نقاب کے بعض گوشے اٹھا بھی دیے کہ یہود بھی جان لیں کہ اللہ ان کے کارناموں سے بے خبر نہیں ہے اور مسلمان بھی متنبہ ہو جائیں کہ اس پردے میں کون چھپا ہوا ہے۔ یہاں خاص طور پر لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ، إِنِّي أَرَى مَا لَا تَرَوْنَ' اور بعض دوسرے فقروں پر غور فرمائیے تو اصل حقیقت واضح ہو جائے گی۔

یہود کے باطن کی تعبیر

شیطان کے متعلق یہ بات جو بیان ہوئی ہے کہ وہ انسان کو کفر پر اکسا کر خود یہ کہہ کر کنارہ کش ہو جاتا ہے کہ 'میں تم سے بری ہوں' میں اللہ رب العٰلمین سے ڈرتا ہوں، یہ اس کے رویہ اور اس کے باطن کی تعبیر ہے، یہ بات شیطان زبان سے کسی کفر کرنے والے سے نہیں کہتا۔ اسی طرح یہاں یہود کے متعلق جو یہ بات بیان ہوئی ہے کہ 'وَقَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكُمْ، إِنِّي أَرَى مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ'، یہ ان کے رویے اور ان کے ذہن کی تعبیر ہے، یہ نہیں ہے کہ انھوں نے یہ بات قریش سے الفاظ میں کہی ہو۔ قرآن نے جگہ جگہ 'قَالَ' کا لفظ اس بات کے لیے بھی استعمال کیا ہے جو آدمی اپنے دل میں کہتا ہے۔ یہود اپنے جوش حسد سے اندھے ہو کر یہ تو دل سے چاہتے تھے کہ قریش محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ختم کر دیں لیکن دل میں چونکہ یہ چور بھی تھا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، ان سے ٹکرانا پہاڑ سے ٹکرانا اور اپنے آپ کو تباہ کرنا ہے اس وجہ سے خود سامنے آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چاہتے تھے کہ یہ خطرہ کوئی اور مول لے۔

یہود کا شیطانی تقویٰ

یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ دوسروں کو کسی جرم پر آمادہ کر دینا اور خود مجرموں کے ساتھ اس جرم کے لیے اس اندیشے سے نہ نکلنا کہ کسی لپیٹ میں نہ آ جائیں یہ شیطانی تقویٰ ہے۔ قرآن نے اوپر واضح فرما دیا کہ جو جرم کے لیے دوسروں کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں لیکن خود اس میں اس خوف سے شریک نہیں ہوتے کہ خدا کی پکڑ میں نہ آ جائیں ان کا یہ خوف ان کو خدا کے عذاب سے نہیں بچائے گا بلکہ جس طرح جرم کے اکھاڑے میں اترنے والے جہنم میں جھونک دیے جائیں گے اسی طرح اکھاڑے کے کنارے بیٹھ کر داؤں پیچ بتانے والے بھی جہنم میں جھونک دیے جائیں گے اگرچہ بزعم خود وہ خدا کے ڈر ہی سے اکھاڑے میں نہیں اترے۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی ہے جو دوسروں کو تو چوری اور بدمعاشی کی تربیت دیتا ہے لیکن خود اپنے تربیت دیے ہوئے چوروں اور بدمعاشوں کے ساتھ چوری اور بدمعاشی کے لیے اس ڈر سے نہیں نکلتا کہ کہیں پولیس کی گرفت میں نہ آ جائے۔ ظاہر ہے کہ قانون کے ایسے احترام کرنے والوں کو کوئی قانون نہیں بخشتا بلکہ جب یہ زد میں آ جاتے ہیں تو یہ بھی اپنے مریدوں ہی کے انجام سے دوچار ہوتے ہیں بلکہ ان پر کچھ زیادہ مار پڑتی ہے۔ یہی بات قرآن نے 'فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا' والی آیت میں فرمائی ہے جو سورۂ حشر کے حوالے سے ہم نے اوپر نقل کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہود بھی مسلمانوں کے معاملے میں اسی شیطانی تقویٰ

میں مبتلا تھے۔ وہ یہ تو دل سے چاہتے تھے کہ مسلمان تباہ کر دیے جائیں، اس مقصد کے لیے وہ قریش کو چڑھا بھی لائے لیکن خود قریش کے ساتھ میدان جنگ میں اترنے کے لیے تیار نہ ہوئے اس لیے کہ اس خدائی فوج اور پولیس کا بھی ان کو ڈر لگا ہوا تھا جس کا اشارہ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ سے نکلتا ہے۔

اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ۭ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (۴۹)

سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ لفظ مَرَضٌ جب نفاق کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد حسد ہوتا ہے۔ یہود کی ریشہ دوانیوں کے بعد اب یہ منافقین اور حاسدین کی حوصلہ شکنیوں کا ذکر فرمایا کہ انھوں نے بھی اس موقع پر مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ ان لوگوں کو ان کے دین نے خبط میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہیں تو مٹھی بھر، مقابلہ کرنے اٹھے ہیں قریش کی دل بادل فوج سے۔ یہ ہاتھی سے گنا کھانے چلے ہیں۔ مذہب کے خبط نے ان کو ہوش و خرد سے عاری کر دیا ہے۔ اس قسم کے فقرے اور طعنے بالخصوص جب کہ اپنے اندر ہی کے لوگوں کی زبان سے نکلیں اور حالات بھی بے سروسامانی اور قلت تعداد کے اعتبار سے وہ ہوں جو بدر کے موقع پر تھے تو ان کے اثرات بہت خطرناک ہو سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے زہر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھا۔ منافقین کے طعنے

وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ، مطلب یہ ہے کہ ان منافقین و حاسدین کے علی الرغم جو لوگ اللہ پر بھروسہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا غالب اور حکیم ہے۔ وہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کا خود ساتھی بنتا ہے، اس کی قوت کو کوئی شکست نہیں دے سکتا، وہ ان کے لیے خود تدبیر فرماتا ہے اور اس کی تدبیر کے مقابل میں کسی کی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔

۱۰۔ آگے کا مضمون —— آیات ۵۰-۵۸

آگے یہ واضح فرمایا کہ یہ مار جو ان پر پڑی اسی پر بس نہیں ہے۔ اصل سزا جو انھیں ملنی ہے اس کا مرحلہ تو آگے آنے والا ہے، جب یہ موت سے دوچار ہوں گے۔ یہ مار تو محض تنبیہ ہے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنی بخشی ہوئی نعمتوں سے محروم نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنی روش بگاڑ نہ لے۔ جب کوئی قوم اپنی روش بگاڑ لیتی ہے تو پہلے اللہ اس کو تنبیہ فرماتا ہے۔ جب وہ تنبیہ سے کوئی سبق نہیں لیتی بلکہ اپنی سرکشی میں بڑھتی جاتی ہے تو پھر اس پر خدا کا فیصلہ کن عذاب آ جاتا ہے۔ قوم فرعون کے ساتھ اللہ نے جو معاملہ کیا وہ ان کے لیے مثال ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کو مختلف آزمائشوں میں پکڑا کہ وہ آنکھیں کھولیں لیکن جب انھوں نے آنکھیں نہیں کھولیں تو خدا نے ان کا بیڑا غرق کر دیا۔

اس کے بعد یہ واضح فرمایا کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ ناپاک وجود ان لوگوں کا ہے جو کفر پر اڑ

گئے ہیں اور ایمان لانے والے نہیں ہیں جو تم سے معاہدہ کر کے بار بار اپنے معاہدہ کو توڑتے ہیں۔ اگر یہ کسی جنگ میں تمہارے مقابل میں آئیں تو ان کو ایسی مار مارو کہ جو ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں ان کو بھی سبق مل جائے اور ان میں سے جس کی طرف سے بھی اب معاہدہ کی خلاف ورزی کا اندیشہ ہو اس کا معاہدہ اس کے منہ پر پھینک مارو، خدا ایسے بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۰-۵۸ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ
وَأَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٥٠﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ
أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٥١﴾ كَدَأْبِ آلِ
فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ فَأَخَذَهُمُ
اللّٰهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٥٢﴾ ذٰلِكَ
بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا
مَا بِأَنفُسِهِمْ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٥٣﴾ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ
وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ فَأَهْلَكْنٰهُم بِذُنُوبِهِمْ
وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوا ظٰلِمِينَ ﴿٥٤﴾ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ
عِندَ اللّٰهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٥﴾ الَّذِينَ عٰهَدتَّ
مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ﴿٥٦﴾
فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ
يَذَّكَّرُونَ ﴿٥٧﴾ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ
ع ۱۰ ۴ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ﴿٥٨﴾

ترجمہ آیات ۵۰-۵۸ اور اگر تم دیکھ پاتے جب فرشتے ان کفر کرنے والوں کی روحیں قبض کرتے ہیں مارتے

ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر، اور یہ کہتے ہوئے کہ اب چکھو مزا جلنے کے عذاب کا۔ یہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت ہے اور اللہ بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ ۵۰-۵۱

ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوا جو قوم فرعون اور ان لوگوں کے ساتھ ہوا جو ان سے پہلے گزرے۔ انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا۔ بے شک اللہ قوی، سخت پاداش والا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ اس انعام کو جو وہ کسی قوم پر کرتا ہے اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اس چیز کو نہ بدل ڈالے جس کا تعلق خود اس سے ہے اور بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ان کے سامنے وہی معاملہ ہے جو آلِ فرعون اور ان لوگوں کو پیش آیا جو ان سے پہلے گزرے۔ انھوں نے اپنے رب کی آیتوں کی تکذیب کر دی تو ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور آل فرعون کو غرق کر دیا اور یہ سارے کے سارے ظالم تھے۔ ۵۲-۵۴

بے شک بدترین جانور اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور وہ ایمان نہیں لاتے، جن سے تم نے عہد لیا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ ڈرتے نہیں۔ پس اگر تم انھیں جنگ میں پاؤ تو انھیں ایسی مار مارو کہ جو ان کے پیچھے ہیں ان کو بھی تتر بتر کر دو تاکہ ان کے ہوش ٹھکانے ہوں اور اگر تمھیں کسی قوم سے بدعہدی کا خطرہ ہو تو تم بھی اسی طرح ان کا عہد ان پر پھینک مارو۔ اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۵۵-۵۸

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا
عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (۵۰-۵۱)

جوابِ شرط کے حذف کا ایک خاص محل

'وَلَوْ تَرَىٰ' جوابِ شرط یہاں محذوف ہے اور اس طرح کے مواقع میں، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم ذکر کر چکے ہیں، جوابِ شرط کا محذوف ہونا ہی تقاضائے بلاغت ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ جس منظر کے دیکھنے کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کی ہولناکی ناقابلِ بیان ہے۔

مبالغہ فی النفی کا اسلوب

'لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ' میں بھی عربی زبان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ عربی میں مبالغہ پر جب نفی آتی ہے تو اس سے مبالغہ فی النفی کا مضمون پیدا ہوتا ہے۔ یعنی خدا بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ امرؤالقیس نے 'لَيْسَ بِفَعَّالٍ' اور 'لَيْسَ بِقَتَّالٍ' کے قسم کی ترکیبیں استعمال کی ہیں یعنی فلاں میں کچھ بھی کرنے کی صلاحیت نہیں، فلاں میں لڑنے کا ذرا دم خم نہیں، بس باتوں کا غازی ہے، کردار کا غازی نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کفار کو بدر میں جو مار پڑی یہ کیا ہے، اصل مار تو وہ ہے جو فرشتوں کے ہاتھوں ان کی موت کے وقت ان پر پڑتی ہے۔ اگر کہیں اس کو دیکھ پاتے تو کچھ اندازہ ہوتا کہ ان کی کیا درگت بننے والی ہے۔ پھر اس کے بعد عذابِ دوزخ کا مرحلہ ہے جس کا آج کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہر ایک کے آگے اس کے اپنے اعمال پیش ہوں گے

'ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ' یعنی ان کے سامنے یہ انھی کے ہاتھوں کی کرتوت رکھی جائے گی۔ جو بس بھری فصل انھوں نے دنیا میں بوئی، سینچی اور پروان چڑھائی اسی کا حاصل ان کے سامنے آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کوئی ظلم و ناانصافی نہیں کرے گا۔ وہ اپنے بندوں کے ساتھ رتی بھر ظلم کا بھی روادار نہیں۔ اس کا قانون اور عدل بے لاگ ہے۔ ہر شخص جو کرے گا وہی بھرے گا۔

كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ
إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ
حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۙ وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ
كَذَّبُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوا ظَالِمِينَ (۵۲-۵۴)

'آل' کا مفہوم

'كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ'۔ 'آل' پر دوسری جگہ ہم تفصیل سے بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ یہ صرف اولاد کے معنی میں نہیں آتا بلکہ اس کا اطلاق قوم اور اتباع سب پر ہوتا ہے۔

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ قریش کو یہ افتاد جو پیش آئی ہے یہ اسی طرح کا معاملہ ہے جیسا کہ قومِ فرعون اور اس سے پہلے کی قوموں کو پیش آیا کہ انھوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری، اس کی نشانیوں کی ناقدری اور اس کی آیات کا انکار کیا تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا اس لیے کہ خدا قوی اور اپنے

قانون پاداش عمل کے اجرا و نفاذ میں بے لاگ ہے۔

عذاب بطور تنبیہ

قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوبِهِمْ سے اس نوعیت کی پکڑ کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ قوموں کو بطور تنبیہ مبتلا کرتا ہے۔ نبی کی بعثت کے دور میں اس طرح کی تنبیہات کا خاص طور پر ظہور ہوتا ہے۔ اس سنت الٰہی کی تفصیل کے لیے اعراف ۹۴۔ انعام ۴۲۔ بقرہ ۱۵۵ ملاحظہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ افتاد جو قریش کو پیش آئی ہے اس سے مقصود ان کو جھنجھوڑنا اور جگانا ہے۔ یہ بات سنت الٰہی کے مطابق ظہور میں آئی ہے اور اس کی مثالیں پچھلی قوموں کی تاریخ میں بھی گزر چکی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قریش اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں یا اپنی پیشرو قوموں کی تقلید میں اللہ کی آیات اور نبی کی دعوت کی تکذیب پر اڑ جاتے ہیں۔ اگر یہ تکذیب پر اڑ گئے تو پھر اللہ ان کو بھی اسی طرح ہلاک کر دے گا جس طرح آل فرعون اور دوسری قوموں کو اس نے ہلاک کیا۔

یہاں كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ دو مرتبہ آیا ہے یہ تکرار نہیں ہے بلکہ دونوں جگہ دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلے یہ بتایا کہ یہ اسی نوع کی تنبیہ ہے جس نوع کی تنبیہ فرعون اور دوسری قوموں کو کی گئی۔ پھر یہ بتایا کہ اگر اس تنبیہ سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو بالآخر ان پر بھی اسی طرح فیصلہ کن عذاب آجائے گا جس طرح ان قوموں پر آیا۔

تذکیر و تنبیہ کا مقصد

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ، یہ حکمت بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کیوں فرمایا کہ قوموں کو تذکیر و تنبیہ ہوتی رہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر انعام فرماتا ہے تو یوں ہی نہیں فرماتا بلکہ وہ انعام کچھ صفات و کردار پر مبنی ہوتا ہے، اسی طرح جب وہ کسی قوم کو اپنے اس انعام سے محروم کرتا ہے تو یوں ہی محروم نہیں کر دیتا بلکہ وہ یہ دیکھ کر کرتا ہے کہ قوم نے اپنے آپ کو ان صفات و اخلاق سے محروم کر لیا جن کی بنا پر وہ مستحق انعام ٹھہری تھی۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ جب کوئی انعام یافتہ قوم خرابیوں میں مبتلا ہو تو خدا تذکیر و تنبیہ کے ذریعہ سے اس پر حجت تمام کر دے۔ اس تذکیر و تنبیہ سے اگر قوم بیدار ہو گئی تو اس کا استحقاق باقی رہتا ہے۔ اگر نہ بیدار ہوئی تو وہ اللہ کی نعمت سے اتمام حجت کے بعد محروم ہو جاتی ہے اور ساری ذمہ داری خود اسی پر ہوتی ہے، خدا اس سے کوئی ناانصافی نہیں کرتا۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ ابھی موقع باقی ہے اس سے فائدہ اٹھالو۔ خدا نے تم پر جو انعام فرمایا تھا وہ تم سے زبردستی نہیں چھیننا چاہتا بلکہ تمھارے عقائد و اعمال کے بگاڑ نے اس کے اسباب پیدا کیے ہیں۔ تم اپنے آپ کو بدل کر اور اصلاح کر کے پھر اپنے استحقاق کو بحال کر سکتے ہو۔

خدا کا معاملہ سمع و علم پر مبنی ہوتا ہے

وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ یعنی قوموں کے عزل و نصب میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ اندھے کی لاٹھی کی طرح نہیں ہے بلکہ تمام تر سمع و علم پر مبنی ہے۔ وہ قوموں کو اختیار و اقتدار اور اسباب و وسائل دے کر برابر ہر چیز کو دیکھتا، سنتا اور جانتا رہتا ہے کہ وہ کیا بنا رہی ہیں اور کس راہ پر جا رہی ہیں اور اس کا معاملہ ان کے ساتھ اسی بے خطا سمع و علم پر مبنی ہوتا ہے۔

تنبیہات سے فائدہ نہ اٹھانے والوں کا انجام

كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ، یہ وہ انجام بیان ہو رہا ہے جو آگے قریش کا ہو گا اگر انھوں نے ان تنبیہات

سے سبق حاصل نہ کیا جو ان کو کی جا رہی ہیں۔ یعنی پھر وہ تنبیہات کے بجائے خدا کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آجائیں گے۔ ان دونوں آیتوں میں الفاظ اور لہجہ کا جو فرق ہے اس کو نگاہ میں رکھیے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا ہے کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ اس میں ہے کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ، اوپر ہے فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ بِذُنُوۡبِہِمۡ، یہاں ہے فَاَہۡلَکۡنٰہُمۡ بِذُنُوۡبِہِمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ۔ اس فرق کو ملحوظ رکھے بغیر دونوں آیتوں کا موقع و محل واضح نہیں ہوگا۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۞ اَلَّذِیۡنَ عٰہَدۡتَّ مِنۡہُمۡ ثُمَّ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَہُمۡ فِیۡ کُلِّ مَرَّۃٍ وَّہُمۡ لَا یَتَّقُوۡنَ ۞ فَاِمَّا تَثۡقَفَنَّہُمۡ فِی الۡحَرۡبِ فَشَرِّدۡ بِہِمۡ مَّنۡ خَلۡفَہُمۡ لَعَلَّہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ۞ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِیَانَۃً فَانۡۢبِذۡ اِلَیۡہِمۡ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡخَآئِنِیۡنَ (۵۵-۵۸)

یہود کی وعدہ خلافیاں

اب یہ یہود اور ان قبائل کے باب میں ہدایت دی جا رہی ہے جن سے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ناطرفداری کے معاہدے کر لیے تھے مثلاً جہینہ، بنی ضمرہ، بنی مدلج وغیرہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کیے ہوئے معاہدے کا برابر احترام باقی رکھا لیکن یہود نے ایک دن بھی اس کا احترام نہیں کیا اور یہ قبائل بھی یہود کی انگیخت یا قریش کے دباؤ سے برابر معاہدے کی خفیہ یا علانیہ خلاف ورزیاں کرتے رہے۔

'شَرَّ الدَّوَآبِّ' کا مفہوم

'اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ' کے اسلوب میں جو زور اور شدت ہے اس کی وضاحت آیت ۲۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہ اسلوب ان لوگوں کے وجود اور بقا کے جواز کی نفی کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ کی قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک ان میں کوئی رمق سوچنے سمجھنے کی باقی ہے۔ جن کے اندر یہ رمق ختم ہو گئی، نہ وہ پہلے ایمان لائے، نہ آئندہ ایمان لانے والے ہیں، اب وہ صرف گندگی کے ایک ڈھیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب خدا کی زمین پر ان کے باقی رہنے میں کوئی خیر و برکت نہیں ہے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ جن کی آنکھوں کے پردے رسول کے بعد بھی نہیں اٹھتے ان کا اندھا پن لاعلاج ہوتا ہے اور زمین پر ان کا باقی رہنا بالکل بے مقصد ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو جینے کی جو مہلت دیتا ہے صرف جینے کے لیے نہیں دیتا بلکہ سوچنے سمجھنے اور زندگی سنوارنے سدھارنے کے لیے دیتا ہے۔

مذکورہ گروہ کی اخلاقی پستی

'اَلَّذِیۡنَ عٰہَدۡتَّ مِنۡہُمۡ ثُمَّ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَہُمۡ فِیۡ کُلِّ مَرَّۃٍ وَّہُمۡ لَا یَتَّقُوۡنَ' یہ انہی لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے۔ 'مِنۡہُمۡ' یعنی مِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا، اوپر ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ ان لوگوں نے معاہدہ تو کر لیا لیکن اس کو وفاداری کے ساتھ نبھایا ایک دن بھی نہیں۔ جب کوئی موقع امتحان کا آتا وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز نہ آتے۔ ان کی ہمدردیاں برابر قریش کے ساتھ رہیں۔ معاہدہ کر لینے کے

بعد بار بار نقضِ عہد کا ارتکاب یہ ان کے دل کی سختی، کردار کی پستی اور ان کے احساسِ غیرت و حمیت سے خالی ہونے کی دلیل تھی۔ 'فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ' سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح کے حالات کے لیے معاہدہ وجود میں آیا تھا اس طرح کی کوئی آزمائش جب کبھی پیش آتی تو یہ معاہدہ کا احترام نہ کرتے بلکہ اس کی خلاف ورزی کر گزرتے۔ 'لَا يَتَّقُوْنَ' سے یہاں مطلب یہ ہے کہ نقضِ عہد اور اس کے نتائج سے نہیں بچتے حالانکہ عہد کی پاسداری اور حرمت دنیا کے معروف میں بھی مسلّم ہے اور اللہ کے ہاں بھی اس کی پرسش ہونی ہے۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۔

'ثقف' کے معنی پالینے کے ہیں اور 'تشرید' کے معنی پراگندہ کر دینے، تتر بتر کر دینے کے۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تو یہ جو کچھ کر رہے ہیں پردے میں کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی سامنے آنے کی جرأت نہیں کر رہا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی گروہ سامنے آنے کی جرأت کرے اور جنگ کے میدان میں تمھیں مل جائے تو انھیں ایسی مار مارو کہ ان کے بھی پرخچے اڑ جائیں اور جو ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے پر تول رہے ہیں ان کے پر و بال بھی جھڑ جائیں۔

'لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ' یعنی ان کا انجام دیکھ کر ان کو بھی سبق حاصل ہو کہ اگر انھوں نے بھی یہی حرکت کی تو ان کا بھی یہی انجام ہونا ہے۔

معاہدات سے متعلق ضروری ہدایت

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ۔ یہ مذکورہ قسم کے تمام معاہدوں سے متعلق عام ہدایت دے دی کہ ان کی ذمہ داری تم پر یک طرفہ نہیں ہے صرف اسی صورت میں ہے جب دوسرا فریق بھی ان کا احترام کرے۔ اگر وہ احترام نہیں کرتا تو تم بھی اس معاہدہ کو ان کے منہ پر پھینک مارو۔ 'عَلٰى سَوَآءٍ' کا مفہوم یہ ہے کہ انہی کے برابر کا اقدام تم بھی کرنے کے مجاز ہو۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دینا چاہیے بلکہ جواب ہم وزن ہونا چاہیے۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ لازم قرار دیا ہے کہ ختم معاہدہ کی اطلاع فریق ثانی کو دے دینی چاہیے۔ ان کی اس بات کی کوئی دلیل ان الفاظ میں مجھے نظر نہیں آتی۔ البتہ یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ محض فرضی اندیشہ کسی معاہدے کو کالعدم قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ عملاً اس کی خلاف ورزی کا اظہار ہوا ہو۔ اول تو یہاں 'تَخَافَنَّ' کا جو فعل استعمال ہوا ہے اس میں خود تاکید ہے۔ دوسرے 'عَلٰى سَوَآءٍ' کی قید بھی ان کو نمایاں کر رہی ہے۔

بدعہدوں سے اظہار برأت

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ' یہ اظہار برأت کا کلمہ ہے۔ یعنی اللہ کا ایسے بدعہدوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور جب اللہ کا ان سے کوئی تعلق نہیں تو اہلِ ایمان کوئی تعلق ایسے لوگوں سے کیسے رکھ سکتے ہیں۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اہلِ ایمان ان سے نباہیں تو گویا وہ ان سے نباہیں گے جن سے خدا کو نفرت ہے۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵۹ - ۶۶

آگے مسلمانوں کو جہاد کے لیے برابر تیار رہنے اور اس کے لیے اسلحہ اور قوت فراہم کرنے پر ابھارا ہے۔ اس لیے کہ بدر میں قریش کو جو شکست ہوئی اس نے قریش میں بھی آگ لگا دی اور یہود بھی جواب بمک یہ توقع لیے بیٹھے تھے کہ وہ قریش کے ہاتھوں مسلمانوں کو ختم کرا دیں گے، اپنی اس توقع میں ناکام ہو کر نئے منصوبے بنانے میں پوری طرح سرگرم ہو گئے۔ ان حالات سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو بھی ہدایت ہوئی کہ اب پوری سرگرمی سے جہاد کے لیے تیاری کرو۔

اس ضمن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان بھی دلایا گیا کہ اگر یہ معاندین کوئی مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کا رجحان ظاہر کریں تو تم بھی مصالحت سے گریز نہ کرنا۔ اگر اس مصالحت کے پردے میں انھوں نے کوئی چال چلنے کی کوشش کی تو جس خدا نے اپنی نصرت اور انہی تھوڑے سے مسلمانوں کے ذریعہ سے بدر میں تمھیں فتح دلائی ہے وہ اب بھی تمھارے ساتھ ہے۔

پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی گئی کہ تم مسلمانوں کی تعداد کی کمی سے مطلق ہراساں نہ ہو، تمھارے لیے اللہ اور انہی تھوڑے سے مسلمانوں کی رفاقت کافی ہے۔ یہی قطرے سیلاب بنیں گے۔ مسلمانوں کو اطمینان دلاؤ کہ ان کے دس آدمی کفار کے سو آدمیوں پر بھاری ہوں گے۔ اصلی طاقت دلوں کی طاقت ہوتی ہے نہ کہ محض گنتی کی۔ جو لوگ تمھارے مقابل میں ہیں وہ محض کھوکھلے دل والے ہیں۔

اس مجموعہ کی آخری آیت ۶۶ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں، مسلمانوں کی کثرت کے دور میں نازل ہوئی ہے۔ اس نے مسلمانوں پر سے وہ ذمہ داری کچھ ہلکی کر دی جو اوپر والی آیت میں ان پر عائد ہوتی تھی۔ چونکہ اس کا تعلق اسی مضمون سے تھا اس وجہ سے اس کو یہاں جگہ دی گئی۔ آگے اس کی وضاحت آئے گی۔

آیات ۵۹-۶۶

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿٥٩﴾ وَ
أَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ
تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ
لَا تَعْلَمُونَهُمُ ۚ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٦٠﴾ وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ
فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦١﴾ وَإِن

يُرِيدُوٓا۟ أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ ٱللَّهُ ۚ هُوَ ٱلَّذِىٓ أَيَّدَكَ
بِنَصْرِهِۦ وَبِٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٢﴾ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ
مَا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا مَّآ أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ
أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُۥ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٣﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ حَسْبُكَ ٱللَّهُ
وَمَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٤﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ حَرِّضِ ٱلْمُؤْمِنِينَ ع
عَلَى ٱلْقِتَالِ ۚ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَٰبِرُونَ يَغْلِبُوا۟ مِا۟ئَتَيْنِ ۚ
وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّا۟ئَةٌ يَغْلِبُوٓا۟ أَلْفًا مِّنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ بِأَنَّهُمْ
قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ﴿٦٥﴾ ٱلْـَٔنَ خَفَّفَ ٱللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ
ضَعْفًا ۚ فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّا۟ئَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا۟
مِا۟ئَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوٓا۟ أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۗ
وَٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿٦٦﴾

ترجمانیات ۵۹-۶۶

اور یہ کافر یہ گمان نہ کریں کہ وہ نکل بھاگیں گے، وہ ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکیں گے اور ان کے لیے جس حد تک کر سکو فوج اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جس سے اللہ کے اور تمہارے ان دشمنوں پر تمہاری ہیبت رہے اور ان کے علاوہ کچھ دوسروں پر بھی جنھیں تم نہیں جانتے ہو، اللہ انھیں جانتا ہے اور جو کچھ بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا کر دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ۵۹-۶۰

اور اگر وہ مصالحت کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کے لیے جھک جائیو اور اللہ

پر بھروسہ رکھیو، بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے، اور اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں گے تو اللہ تمھارے لیے کافی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی نصرت سے اور مومنین کے ذریعے سے تمھاری امداد کی۔ اور ان کے دلوں کو باہم جوڑا اور اگر تم زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر ڈالتے تو بھی ان کے دلوں کو باہم نہ جوڑ سکتے لیکن اللہ نے ان کو جوڑ دیا۔ بے شک وہ غالب اور حکیم ہے۔ ۶۱-۶۳

اے نبی تمھارے لیے اللہ اور یہی مومنین جنھوں نے تمھاری پیروی اختیار کی ہے کافی ہیں۔ اے نبی مومنین کو جہاد پر ابھارو۔ اگر تمھارے بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمھارے سو ہوں گے تو ہزار کافروں پہ بھاری ہوں گے یہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ بصیرت سے محروم ہیں۔ ۶۴-۶۵

اب اللہ نے تمھاری ذمہ داری ہلکی کر دی اور اس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے، سو تمھارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری ہوں گے اور اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ ۶۶

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ (۵۹)

اوپر کی آیات میں کفار کو جو دھمکی دی ہے اور خاص طور پر یہ بات جو فرمائی ہے کہ ان کی ساری دوا دوش اور ان کی تمام جولانیوں کا خدا احاطہ کیے ہوئے ہے یہ اسی مضمون کی تاکید مزید ہے۔ فرمایا کہ اب ہم نے ان کا تعاقب شروع کر دیا ہے۔ اب یہ اس غلط فہمی کو ذہن سے نکال دیں کہ یہ ہم سے بچ کے نکل جائیں گے۔ یہ ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکتے۔ 'اعجزہ الصید' کے معنی ہوں گے فاتہ فلم یقدر علیہ شکار قابو سے باہر نکل گیا۔ پکڑا نہ جا سکا۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۶۰)

لفظ قوۃ کا مفہوم — 'وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ'۔ لفظ 'قوۃ' قرآن میں، جیسا کہ ۶۹-توبہ، ۸۰ ہود، ۹۵ کہف، ۱۵ فصّلت اور دوسری آیات سے واضح ہے، عددی قوت اور (MAN. POWER) کے لیے بھی آتا ہے۔

رباط الخیل سے مراد — 'رباط الخیل' سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو خاص جنگ کے لیے تربیت دیے جائیں اور اسی غرض کے لیے محفوظ اور تیار رکھے جائیں۔ جنگ میں ہر قسم کے گھوڑے کام نہیں آتے۔ اس زمانے کی جنگ میں گھوڑوں ہی کی اصل اہمیت بھی تھی اور عرب کی مخصوص آب و ہوا کے لحاظ سے ان کے ہاں گھوڑوں کی تربیت کا خاص اہتمام بھی تھا۔

مسلمانوں کو جنگی تیاریوں کا حکم — اسی چیز کی ہدایت یہاں مسلمانوں کو کی گئی ہے کہ جہاد کے لیے قابلِ جہاد لوگوں کو بھی منظم کرو اور تربیت دیے ہوئے گھوڑے بھی تیار رکھو۔ اب تک تو جب کسی جنگی مہم کی صورت پیش آتی عرب کے عام دستور کے مطابق یہ ہوتا کہ ہر سپاہی، جو سامان اس کو میسر ہوتا اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا لیکن اس آیت میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ اپنی فوجی قوت نفری کے اعتبار سے بھی اور اسلحہ و اسباب جنگ کے اعتبار سے بھی زیادہ سے زیادہ بڑھائیں۔ اس زمانے کی جنگ میں گھوڑوں کو وہی اہمیت حاصل تھی جو اس زمانے میں ٹینک اور ہوائی جہاز کو حاصل ہے جنگ بدر میں مسلمانوں کے ساتھ گھوڑے بہت کم تھے۔ آگے کے مراحل کے لیے ان کی تعداد زیادہ کرنے کی تاکید ہوئی۔

مسلمانوں کے دشمن اللہ کے دشمن — 'تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ' یہ اس تیاری کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ کے اور تمھارے دشمنوں پر تمھاری دھاک اور ہیبت قائم رہے کہ تمھیں نرم چارہ سمجھ کر وہ تم پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کریں۔ یہاں مسلمانوں کے تمام دشمنوں کو اللہ کا دشمن ٹھہرایا ہے اس لیے کہ مسلمانوں کی جنگ جس سے بھی تھی، اللہ کے دین کے لیے تھی، اس میں کسی اور چیز کا کوئی دخل نہیں تھا۔

مسلمانوں کے پس پردہ دشمنوں کی طرف ایک اشارہ — 'وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ' اور مسلمانوں کے یہ دشمن دو قسم کے تھے۔ ایک تو وہ جو سامنے آچکے تھے، مثلاً قریش جو روزِ اول سے دشمن تھے۔ دوسرے وہ جو ابھی پردے میں تھے۔ مثلاً یہود، جن کی خفیہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ نیز وہ قبائل جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدۂ غیر جانبداری تھا لیکن، یہود اور قریش کی تحریک سے وہ بھی پر تولنے لگ گئے تھے۔ علاوہ ازیں وہ منافقین جو منافقت میں بڑے مشاق تھے اور برابر دشمنوں کی مقصد برآری کے لیے مصروف سازش رہتے تھے۔ قرآن نے سورۂ توبہ میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ	اور تمھارے اردگرد جو اعراب ہیں ان میں بہتیرے
وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا	منافق ہیں اور اہل مدینہ میں بھی منافق ہیں۔ یہ اپنے
عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ	نفاق میں بڑے مشاق ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے۔
سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ	ہم ان کو جانتے ہیں۔ ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے
اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (۱۰۱ توبہ)	پھر یہ ایک عظیم عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے۔

علاوہ ازیں بیرونی طاقتیں مثلاً رومی، غسانی، ایرانی وغیرہ بھی تھیں جو بعد میں اس وقت سامنے آئیں جب اسلام نے پورے عرب کو زیرنگین کرلیا۔ قرآن نے یہاں مسلمانوں کو حاضر سے متعلق ہدایت دیتے ہوئے ان دشمنوں کی طرف بھی ایک اشارہ کردیا جو مستقبل قریب یا مستقبل بعید کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں تاکہ مسلمان دور تک نگاہ رکھ کر منصوبہ بندی کریں، یہ نہ خیال کریں کہ محض ایک وقتی جھونکا تھا، جو آیا اور اب گزر گیا ہے۔

جنگی تیاریوں کے لیے انفاق

'وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الآیہ' جنگی تیاریوں کے سلسلہ میں انفاق کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے کہ اس مقصد کے لیے جو کچھ بھی خرچ کروگے تمھارا کوئی دھیلا پیسہ بھی ضائع جانے والا نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں تمھارا پائی پائی کا حساب موجود رہے گا اور وہ سب تمھیں پورا کردیا جائے گا، اس میں ذرا کمی نہیں ہوگی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'پورا کیا جانا' اسی اصول کے مطابق ہوگا جو نیکیوں کے اجر کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اور جو قرآن میں دوسرے مقام میں مذکور ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۶۱-۶۳)

صلح جوئی کی اجازت

'وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ' سَلْمٌ، سِلْمٌ، صلح اور مصالحت کے معنی میں آتا ہے اور یہ مؤنث بھی استعمال ہوتا ہے۔

اجتماعی اصول عدل کا احترام

اوپر جنگ کا جو حکم دیا ہے وہ 'حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ' کی تصریح کے ساتھ ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ قریش کے ساتھ یہ جنگ اس وقت تک ختم ہونے والی نہیں ہے جب تک فتنہ کا اور سرزمین حرم سے ہر شائبہ شرک و کفر کا استیصال نہ ہوجائے۔ یہاں یہ واضح فرمایا کہ یہ حکم اس بات کے منافی نہیں ہے کہ کسی مرحلے میں قریش اگر صلح کے خواہاں ہوں تو ان سے صلح کرلی جائے ان کی صلح کی پیشکش کو قبول کرنے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دے دی گئی۔ اس وقت تک قریش کے لیڈروں نے جس عناد کا اظہار کیا تھا اس کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کوئی مصالحت نیک نیتی

سے کریں گے بلکہ اندیشہ تھا کہ شرارت کرنے اور دھوکہ دینے ہی کے لیے کریں گے اس وجہ سے ان پر اعتماد کرنے کا مسئلہ بڑا مشکل تھا۔ تاہم چونکہ اجتماعی اصول عدل اسی بات کا مقتضی تھا کہ حریف کی صلح کی پیشکش ٹھکرائی نہ جائے اس وجہ سے آنحضرتؐ کو ہدایت ہوئی کہ اس اندیشے کے باوجود مصالحت قبول کر لینا اور اللہ پر بھروسا رکھنا۔ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اگر اس کے اعتماد پر تم ایک مقصدِ خیر کی خاطر خطرہ مول لو گے تو اللہ تمھاری مدد فرمائے گا اور حریف اس سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے میں کامیاب نہ ہوگا۔

بین الاقوامی معاملات میں الحق کا احترام

'وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ' یعنی زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ یہی تو کہ وہ تمھیں دھوکہ دینے کی کوشش کریں گے تو اس کی پروا نہ کرنا، اللہ تمھارے لیے کافی ہے۔ 'اللہ تمھارے لیے کافی ہے' کے اجمال میں جو کچھ مضمر ہے قلم اس کی تعبیر سے اگرچہ قاصر ہے لیکن وہ بغیر کسی اظہار کے بھی ظاہر ہے۔ یہاں خاص طور پر غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام حق و انصاف کے جس اصول کی تلقین انسان کو اس کی انفرادی زندگی کے لیے کرتا ہے۔ اسی کی تلقین اس کی اجتماعی زندگی کے لیے کرتا ہے اور اسی کی تلقین اس کی بین الاقوامی زندگی کے لیے بھی کرتا ہے اور اس تصریح کے ساتھ کرتا ہے کہ اگر اس میں کچھ خطرہ اور اندیشہ بھی ہو جب بھی کسی خیر کی پیشکش ٹھکرائی نہ جائے۔ بلکہ اللہ پر بھروسہ کر کے وہ قبول کر لی جائے۔ یہ توکل علی اللہ یہاں خاص طور پر نگاہ میں رہے۔ معلوم ہوا کہ توکل صرف مسجد کی چاردیواری تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ میدانِ جنگ میں بھی اہل ایمان کی قوت اور بین الاقوامی معاملات میں بھی اہل ایمان کی پشت پناہ ہے۔

'هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ' یہ اس 'حسبک اللہ' کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ جس خدا نے بدر میں اپنے فرشتوں کی فوج سے تمھاری مدد کی اور مٹھی بھر مسلمانوں سے کفار کی دل بادل فوج کچلوا دی وہ خدا تمھاری اس وقت بھی مدد فرمائے گا جب تمھارے یہ حریف صلح کے پردے میں تمھارے خلاف جنگ کی اسکیمیں بنائیں گے اور تمھاری نیکی سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔

خدا ساز بات

'وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ' اوپر جو یہ اشارہ ہوا ہے کہ اللہ نے مومنین کے ذریعہ سے تمھاری مدد فرمائی، یہ اس کی وضاحت ہے کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ خاص تائید غیبی ہی کا یہ کرشمہ ہے۔ کسی شیطانی مقصد کے لیے کسی بھیڑ کا اکٹھا کر لینا تو مشکل نہیں ہوتا، ہر نعرہ باز یہ کام کر سکتا ہے لیکن خاص اللہ کے کام کے لیے جس میں خدا کی خوشنودی اور آخرت کی طلب کے سوا کسی بھی دوسری چیز کا کوئی ادنیٰ شائبہ نہ ہو، کلمۂ حق کے جاں نثاروں کی ایک جمعیت کا فراہم ہو جانا بغیر اس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللہ نے تائید کی اور اس کی توفیق بخشی نے رہنمائی فرمائی۔ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمع ہوئے تھے، اپنی یہ نئی زندگی اختیار کرنے سے پہلے، دورِ جاہلیت کی تمام برائیوں میں آلودہ تھے، ان کے قبیلے جدا جدا تھے اور ان میں شدید قسم کے تعصبات تھے، ان کے دیوتا الگ الگ تھے اور یہ آنکھیں بند کر کے ان کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے مفادات باہم متصادم تھے اور یہ ان کے

حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز اور عدل و ظلم کے تمام حدود و قیود سے آزاد تھے۔ اس طرح کے لوگوں کو ان کے تمام تعصبات و مفادات اور تمام رسوم و عادات سے چھڑا کر بالکل ایک نئے سانچہ میں ڈھال دینا اور اس سانچے کو ان کی نگاہوں میں اتنا محبوب بنا دینا کہ اس کی خاطر وہ قوم، وطن، خاندان، جائداد اور بیوی بچے سب کو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں، یہ خدا ہی کے لیے ممکن ہے۔ کوئی انسان یہ کام نہیں انجام دے سکتا اگرچہ وہ دنیا جہان کے سارے وسائل اس پر صرف کر ڈالے۔

اللہ عزیز و حکیم ہے۔ وہ جو کام کرنا چاہتا ہے کر ڈالتا ہے اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ اشارہ ہے ہدایت و ضلالت کے اس قانون کی طرف جس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۶۴-۶۵)

مسلمانوں کو جہاد پر ابھارنے کی ہدایت

'يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ' یہ آیت تمہید ہے اس حکم کی جو بعد والی آیت میں مسلمانوں کو جہاد پر ابھارنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے اللہ کی مدد اور ان تھوڑے سے مسلمانوں ہی کی رفاقت کافی ہے، تو تم کفار کی کثرت اور اپنے ساتھیوں کی قلت کی فکر نہ کرو۔ گویا وہی بات جو اوپر فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے، یہاں دوسرے اسلوب سے کہی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ 'وَمَنِ اتَّبَعَكَ' کا عطف 'اللہ' پر ماننے سے شرک کا پہلو پیدا ہوتا ہے لیکن یہ خیال کلام کے سیاق و سباق پر غور نہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے جو تاویل کی ہے وہ بالکل واضح، قرآن کے نظائر کے مطابق اور شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔

مسلمانوں اور کافروں کی قوت کا تناسب

'يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ' یہ اسی اوپر والے مضمون کی وضاحت ہے کہ ہر چند تمہارے ساتھیوں کی تعداد باعتبار کمیت تھوڑی ہے لیکن باعتبار کیفیت بہت ہے۔ تمہارے بیس ثابت قدم مسلمان کفار کے دو سو آدمیوں پر اور تمہارے سو آدمی ان کے ہزار آدمیوں پر بھاری ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے ساتھیوں کو اللہ نے بصیرتِ ایمانی سے نوازا ہے اور تمہارے حریف اس بصیرت سے محروم ہیں۔

مسلمان کی اصل قوت

'لَا يَفْقَهُوْنَ' میں 'فقہ' سے مراد بصیرت ایمانی ہے۔ یہی بصیرت انسان کا اصل جوہر ہے۔ اس بصیرت کے ساتھ جب مومن میدانِ جنگ میں نکلتا ہے تو وہ اپنے تنہا وجود کے اندر ایک لشکر کی قوت محسوس کرتا ہے، اس کو اپنے دہنے بائیں خدا کی نصرت نظر آتی ہے، موت اس کو زندگی سے زیادہ عزیز و محبوب ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس کی بصیرت اس کے سامنے اس منزل کو روشن کر کے دکھا دیتی ہے جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہی بصیرت اس کے اندر وہ صبر و ثبات پیدا کرتی ہے جو اس

کو تنہا اس بصیرت سے محروم دس آدمیوں پر بھاری کر دیتی ہے۔

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ
يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۶۶)

مسلمانوں کی ذمہ داری میں تخفیف

'اَلْـٰٔنَ' کا لفظ یہاں اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ آیت اوپر کی آیات کے بہت بعد اس دور میں نازل ہوئی ہے جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ چنانچہ دونوں میں تقابل کی نسبت بھی مختلف ہے۔ اوپر والی آیت میں بیس اور دو سو، سو اور ہزار کا تقابل ہے اور اس میں سو اور دو سو، ہزار اور دو ہزار کا تقابل ہے۔ یہ بھی قرینہ ہے کہ یہ مسلمانوں کی کثرت کے دور کی آیت ہے۔ اس کا تعلق چونکہ اسی مضمون سے تھا اس وجہ سے ترتیب میں اس کو یہیں جگہ ملی۔ قرآن میں نظم کے اعتبار کی ایک دلیل یہ بھی ہے۔

یہ بات کہ دس مسلمان سو پر بھاری رہیں گے وارد تو ہوئی ہے بشارت کے سیاق میں لیکن اس بشارت کے ساتھ اس نے مسلمانوں پر ایک بھاری ذمہ داری بھی ڈال دی تھی کہ بیس مسلمان دو سو کافروں کا اور سو مسلمان ہزار کافروں کا اپنے آپ کو مد مقابل سمجھیں اور اگر کہیں اسی نسبت کے ساتھ ان سے مقابلہ کی نوبت آن پڑے تو قلت تعداد کے عذر پر ان کو پیٹھ نہ دکھائیں۔ چونکہ پیٹھ دکھانے کا گناہ، جیسا کہ آیت ۱۶ میں بیان ہوا، بہت سخت ہے اس وجہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں نے اس ذمہ داری کو ایک بھاری ذمہ داری محسوس کیا ہوگا اور اسی احساس کے ساتھ اس کو ادا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ بعد میں جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو یہ بوجھ اللہ تعالیٰ نے ہلکا کر دیا اور سابق نسبت بدل کر سو اور دو سو، ہزار اور دو ہزار کی نسبت قائم کر دی گئی۔

تخفیف کے دو سبب

آیت کے الفاظ سے اس نسبت کی تبدیلی کی دو وجہیں سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو اس نے یہ پسند فرمایا کہ سابقون الاولون کے کندھوں پر جو زیادہ بوجھ ہے وہ ہلکا کر کے دوسرے بعد میں آنے والے مسلمانوں پر ڈال دیا جائے۔

دوسری یہ ہے کہ بعد میں جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے وہ بصیرت و عزیمت کے اعتبار سے سابقون الاولون کے ہم پایہ نہیں تھے۔ بحیثیت مجموعی ان کا درجہ کم ہی تھا اس وجہ سے ان کی کمزوری کا لحاظ کر کے ان کی ذمہ داری بھی کم رکھی۔ اس کا اشارہ 'عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا' سے نکلتا ہے۔ 'ضعف' کا لفظ جسمانی اور مادی کمزوری کے لیے نہیں آتا بلکہ عزم و ارادہ اور معرفت و بصیرت کے ضعف کے لیے بھی آتا ہے۔

ان آیات پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو ایک تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی نصرت کا استحقاق اپنے اندر صفت صبر پیدا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ بغیر اس صفت کے پیدا کیے کسی گروہ کو اللہ کی

مدد حاصل نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ اسباب و وسائل جس رفتار سے بڑھتے جاتے ہیں خدا کی براہِ راست مدد اسی نسبت سے کم ہوتی جاتی ہے۔ تیسری حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ اصل قوت ایمان کی قوت ہے دوسری چیزیں سب اس کے توابع میں سے ہیں۔ چوتھی بات یہ نکلتی ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اصل اعتماد اللہ پر ہونا چاہیے نہ کہ اسباب پر۔

۱۴۔ آگے کا مضمون —— آیات ۶۷-۷۱

آگے قریش کے اس پراپیگنڈے کا جواب دیا ہے جو انھوں نے بدر میں شکست کھانے کے بعد اسلام، مسلمانوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف شروع کیا۔ جنگ بدر سے پہلے تک تو، جیسا کہ پیچھے تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے، وہ اسلام اور مسلمانوں کی کمزوری کو اسلام کے خلاف بطور ایک دلیل کے پیش کرتے تھے۔ کہتے کہ یہ دین اگر حق ہوتا تو کیا اس کو ایسے ہی کمزور و ناتوان حامل ملتے، اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے پیغمبر ہوتے تو کیا وہ ایسے ہی بے وسیلہ و ذریعہ اور بے حامی و مددگار ہوتے، اگر اسلام حق ہوتا تو کیا ہم پر کوئی عذاب نہ آجاتا، مختصر یہ کہ وہ اپنے غلبہ اور اسلام کی مغلوبیت کو اسلام کے باطل ہونے اور اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھہراتے۔ یہاں تک کہ غزوۂ بدر کو انھوں نے خود فیصلہ کی ایک کسوٹی کا درجہ دے دیا اور ان کے لیڈروں نے علانیہ یہ کہا کہ اس جنگ میں جو جیتے گا وہ حق پر سمجھا جائے گا، جو ہارے گا وہ باطل پر سمجھا جائے گا۔ بالآخر جب جنگ کا نتیجہ ان کے خلاف نکلا اور وہ خود اپنی ہی انتخاب کردہ کسوٹی پر کھوٹے ثابت ہو گئے تو انھیں اپنی قوم کو سنبھالنے اور بدر کی شکست کے اثرات سے اس کو بچانے کے لیے اپنے پروپیگنڈے کے رخ کو بدلنا پڑا۔ اب انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ کہیں کسی پیغمبر کے بھی یہ کام ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ہی قوم کو یوں باہم لڑادے، ملک میں خونریزی کرائے، اپنے ہی بھائی بندوں کو قیدی بنائے، ان سے فدیہ وصول کرے، ان کا مال لوٹے اور اس کو اپنے ساتھیوں کو بانٹے کو کھلائے؛ ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ سارے کام تو اقتدار و سلطنت کے طالبوں اور دنیا داروں کے ہیں تو یہ پیغمبر کہاں سے ہوئے اور ان کو خدا سے کیا واسطہ؟

قریش نے اپنے پروپیگنڈے سے ایک طرف تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اپنی قوم کو بدر کی شکست کے اثرات سے بچانا چاہا کہ مبادا مسلمانوں کی اس فتح مبین سے وہ اسلام اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حقانیت کا کوئی تصور قبول کرے، دوسری طرف نہایت ہوشیاری سے مسلمانوں کے اس جوش جہاد پر ضرب لگانی چاہی جو بدر کے بعد قدرتی طور پر بہت نمایاں ہو گیا تھا اور جس پر، اوپر کی آیات میں مسلمانوں کو ابھارا گیا ہے۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اس سلسلہ میں ان کے اس پروپیگنڈے کا جواب دے دیا جائے کہ کم از کم مسلمانوں پر اس کا کوئی برا اثر نہ پڑنے پائے۔ چنانچہ یہاں تمام متعلق گروہوں کو مخاطب

کر کے اس کا جواب دیا گیا۔

پہلے قریش کے لیڈروں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ جو کچھ پیش آیا اس کی ذمہ داری نبی پر نہیں بلکہ خود تم پر ہے۔ کوئی نبی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ وہ قیدی پکڑے، فدیہ وصول کرنے اور مال غنیمت لوٹنے کے لیے زمین میں خونریزی تک نوبت پہنچا دے۔ ان چیزوں کے طالب تم ہو، خدا ان چیزوں کا طالب نہیں ہے۔ شکر کرو کہ ابھی بات یہیں تک رہ گئی۔ ورنہ تم نے جو شرارت کی تھی اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم پر خدا کا کوئی سخت عذاب آجاتا لیکن اللہ نے ہر چیز کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اس وجہ سے تمھیں کچھ مہلت دے دی گئی۔

اس کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم ان شریر لوگوں کے پروپیگنڈے سے ذرا بھی متاثر نہ ہو۔ جو مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے وہ تمھارے لیے بالکل حلال طیب ہے۔

اسی سلسلہ میں جنگ بدر کے ان قیدیوں کو جنھیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا، یہ پیغام دلوایا کہ وہ یہ فدیہ لیے جانے سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ یہ ان کے اوپر ایک احسان کیا گیا ہے اور اگر انھوں نے اس احسان کی قدر کی تو بہت ممکن ہے کہ اللہ ان کو اپنے مزید احسان سے نوازے اور اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی بلکہ پھر اسلام کے مقابل میں جنگ کے لیے آئے تو یاد رکھیں کہ اس سے بھی سخت دن دیکھیں گے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ آیات
تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ۶۷-۷۱
حَكِيمٌ ﴿٦٧﴾ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ
عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٦٨﴾ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا
اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٦٩﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي ۹ ع ۵
أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ
خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٧٠﴾
وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ

مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٧١﴾

ترجمۂ آیات ۶۷-۷۱
کوئی نبی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ اس کو قیدی ہاتھ آئیں یہاں تک کہ وہ اس کے لیے ملک میں خونریزی برپا کر دے۔ یہ تم ہو جو دنیا کے سروسامان کے طالب ہو، اللہ تو آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو روش تم نے اختیار کی اس کے باعث تم پر ایک عذاب عظیم آ دھمکتا۔ ۶۷-۶۸

پس جو مال غنیمت تم نے حاصل کیا اس کو حلال و طیب سمجھ کر کھاؤ برتو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے (۶۹)

اے نبی تمھارے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمھارے دلوں میں کوئی بھلائی پائے گا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تم کو وہ عطا فرمائے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اگر یہ تم سے بدعہدی کریں گے تو اس سے پہلے انھوں نے خدا سے بدعہدی کی تو خدا نے تم کو ان پر قابو دے دیا اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۷۰-۷۱

۱۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۶۷-۶۸)

'ماکان' کا اسلوب بیان نفی الزام کے لیے
مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ، 'مَا كَانَ' کا اسلوب بیان الزام اور رفع الزام دونوں کے لیے آ سکتا ہے اور قرآن میں دونوں ہی قسم کے مواقع میں یہ اسلوب استعمال

ہوا ہے۔ اس امر کا تعین کہ یہ الزام کے لیے ہے یا رفع الزام کے لیے موقع و محل، سیاق و سباق، قرینہ اور مخاطب کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی اسلوب بیان آلِ عمران ۱۶۱ میں ہے۔ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اپنی خیانت کے ساتھ حاضر ہوگا) ظاہر ہے کہ یہ آیت الزام کے لیے نہیں بلکہ رفع الزام اور نبی کی تنزیہ شان کے لیے ہے۔ اس آیت کے بارے میں تمام اہل تاویل کا اتفاق ہے کہ منافقین کو مخاطب کر کے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ تم نبی پر خیانت کی جو تہمت دھرتے ہو یہ سورج پر تھوکنے کی کوشش کے مترادف ہے، کوئی نبی بھی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ وہ خیانت اور بے ذمائی کا مرتکب ہو۔ ٹھیک اسی اسلوب پر آیت زیر بحث میں قریش کی تردید کی گئی ہے کہ تم نبی پر یہ الزام جو لگاتے ہو کہ یہ ہوس اقتدار میں مبتلا ہیں، اپنی قوم میں انھوں نے خونریزی کرائی، اپنے بھائیوں کو قید کیا، ان کا مال لوٹا، ان سے فدیہ وصول کیا، یہ ساری باتیں تمھاری اپنی کھسیاہٹ مٹانے کے لیے ہیں۔ کوئی نبی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ وہ قیدی پکڑنے، فدیہ وصول کرنے اور مالِ غنیمت لوٹنے کے شوق میں ملک میں خوں ریزی برپا کر دے۔ یہ باتیں تم اس لیے کہتے ہو کہ تم نبی کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہو۔ تمھاری چاہتیں چونکہ یہی کچھ ہیں، تم سمجھتے ہو کہ نبی بھی یہی کچھ چاہتا ہے۔

خطاب قریش سے — تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ، یہ خطاب قریش سے ہے۔ قرآن میں خطاب کا انداز، جیسا کہ ہم بارہا واضح بھی کر چکے ہیں، بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے جو ایک اعلیٰ خطیب تقریر میں اختیار کرتا ہے۔ جتنی پارٹیاں سامنے ہوتی ہیں، بیک وقت، سب کی طرف رخ بدل بدل کر ان کے ذہن کے لحاظ سے بات کہتا چلا جاتا ہے۔ خود بات ہی واضح کر دیتی ہے کہ مخاطب کون ہے اور اس کے کس شبہ یا اعتراض کا کیا جواب دیا گیا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ اس آیت کا مخاطب مسلمانوں کو اور وہ بھی سید عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صدیق اکبرؓ کو ماننے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے اور بالفرض اس آیت کا مخاطب دل پر جبر کر کے نبیؐ اور صدیقؓ کو تھوڑی دیر کے لیے کوئی مان بھی لے تو اس کے بعد جو آیت آ رہی ہے اس کا مخاطب نبیؐ اور صدیقؓ کو ماننے کے لیے کوئی دل و جگر کہاں سے لائے۔

اسلوب بیان کی بلاغت — بہرحال ہمارے نزدیک یہ خطاب قریش سے ہے اور یہ ان کے اس پروپیگنڈے کا جواب دیا جا رہا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ فرمایا کہ اس قسم کی دنیا طلبی تمھارا ہی شیوہ ہے۔ اللہ تو آخرت کو چاہتا ہے۔ یہاں اسلوب بیان کی یہ بلاغت ملحوظ رہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ نبی اور اہل ایمان آخرت کے طلب گار ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ اللہ آخرت کو چاہتا ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ نبی اور اہل ایمان کے ہاتھوں جو کچھ یہ ہو رہا ہے یہ ان کی اپنی مرضی سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ اللہ کی مرضی اور اللہ کے حکم سے ہو رہا ہے، نبی اور اہل ایمان کی حیثیت اس سارے کام میں محض آلہ اور واسطہ کی ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں

یہی عین اللہ کا ارادہ اور اس کی مرضی ہے۔ اللہ کی مرضی اپنے بندوں کے لیے یہ ہے کہ وہ ہر کام آخرت کو اپنا نصب العین بنا کر کریں تو نبی اور اس کے ساتھیوں کا کوئی اقدام اللہ کی مرضی کے خلاف کس طرح ہو سکتا ہے۔ گویا بدر اور اس سلسلہ کے تمام اقدامات کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لے لی۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ عزیز و حکیم ہے۔ وہ جو ارادہ فرماتا ہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور اس کا ہر ارادہ عدل و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اب تم جو ژاژ خائی کرنا چاہتے ہو کرتے رہو۔

آگے کے لیے ایک تنبیہ

'لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ' یعنی تم نے اتنے ہی پر یہ واویلا برپا کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہ تو صرف ایک چرکا ہے جو تمہیں لگا ہے۔ تم نے جو شرارت اس موقع پر کی تھی اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس پر تمہیں ایک عذابِ عظیم آ پکڑتا لیکن اللہ نے چونکہ ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، جس سے پہلے کسی قوم کا فیصلہ نہیں ہوتا اس وجہ سے اس نے تمھیں مہلت دے دی۔ مطلب یہ ہے کہ اس شور و غوغا کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤ اور اس فیصلہ کن گھڑی کے آنے سے پہلے پہلے اپنی روش کی اصلاح کر لو۔

'فِيْمَآ اَخَذْتُمْ' میں 'ما' کے ابہام کی یہاں کوئی وضاحت موجود نہیں ہے اور 'اَخَذَ' کا لفظ لینے، پکڑنے، اختیار کرنے، کسی ڈھب کو اپنانے، کسی کام کو شروع کرنے سب کے لیے آتا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ ۔۵۰ (اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ منافق کہتے ہیں خوب ہوا ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا تھا) یہاں یہ مطلب ہوگا کہ جو طریقہ تم نے اختیار کیا اس کی بنا پر تم سزاوار تو تھے ایک عذابِ عظیم کے لیکن اللہ کے قانون کے تحت تمہیں کچھ مہلت مل گئی۔

مفسرین کی ایک الجھن کا ازالہ

ہمارے مفسرین کو ان آیات کی تاویل میں بڑی الجھن پیش آئی ہے۔ ان کے نزدیک یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین پر عتاب ہے کہ وہ زمین میں خوں ریزی کیے بغیر بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے پر کیوں راضی ہو گئے۔ صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اب اس بات کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی تاہم چند باتیں ذہن میں رکھیے۔

ایک یہ کہ فدیہ قبول کرنے کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے بالفرض غلطی ہوتی بھی تو یہ کسی سابق ممانعت کی خلاف ورزی کی نوعیت کی غلطی نہیں تھی بلکہ صرف اجتہاد کی غلطی تھی۔ اجتہاد کی غلطی ایسی چیز نہیں ہے جس پر ایسی سخت وعید وارد ہو۔ بالخصوص ایک ایسا اجتہاد جس کی تصدیق فوراً ہی خود اللہ تعالیٰ نے کر دی ہو۔

دوسری بات یہ کہ یہ اجتہاد کی غلطی بھی نہیں تھی۔ جنگ کے قیدیوں سے متعلق یہ قانون سورۂ محمد میں پہلے بیان ہو چکا تھا کہ وہ قتل بھی کیے جا سکتے ہیں، فدیہ لے کر بھی چھوڑے جا سکتے ہیں اور بغیر فدیہ لیے

محض احساناً بھی چھوڑے جا سکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ جہاں تک خوں ریزی کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے بھی بدر میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ قریش کے ستر آدمی، جن میں بڑے بڑے سردار بھی تھے، مارے گئے، کم و بیش اتنے ہی آدمی قید ہوئے۔ باقی فوج بھاگ کھڑی ہوئی تو آخر لڑائی کس سے جاری رکھی جاتی؟

چوتھی یہ کہ یہاں عتاب کے جو الفاظ ہیں وہ قرآن کے مخصوص الفاظ ہیں۔ جو شخص قرآن کے اندازِ بیان سے آشنا ہے وہ جانتا ہے کہ ان لفظوں میں قرآن نے کفار و منافقین کے سوا اور کسی پر عتاب نہیں کیا ہے۔ نقل کرنے میں طوالت ہوگی، جس کو تردد ہو وہ قرآن میں ان تمام مواقع پر ایک نظر ڈال لے جہاں 'لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ الاٰیۃ' کے الفاظ سے کسی پر عتاب ہوا ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶۹)

مال غنیمت کے حلال ہونے کی یقین دہانی

اب یہ مسلمانوں کی طرف رخ کرکے انھیں اطمینان دلایا کہ تم ان لوگوں کی ان ہفوات کی مطلق پروا نہ کرو، جو مال غنیمت یا فدیہ تمھیں حاصل ہوا ہے اسے کھاؤ برتو، یہ تمھارے لیے حلال و طیب ہے۔ چونکہ یہ بات بعینہٖ اسی بات کا ایک حصہ ہے جو اوپر والی آیات میں مسلمانوں کے دفاع میں کہی گئی ہے اس وجہ سے 'ف' کے واسطہ سے اسی پر عطف کر دی گئی ہے۔ بس اتنا فرق ہوا ہے کہ اوپر کی بات قریش کو مخاطب کرکے کہی گئی ہے اس لیے کہ وہ انہی سے کہنے کی تھی اور اس دوسری بات کا رخ مسلمانوں کی طرف ہو گیا ہے اس لیے کہ یہ انہی کو جتانے کی تھی۔ خطاب میں اس طرح کی جو لطیف تبدیلیاں ہوتی ہیں اس کی متعدد مثالیں خود اس سورہ میں بھی گزر چکی ہیں۔ ایک نہایت عمدہ مثال سورۂ یوسف میں موجود ہے۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۜ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ (۲۹۔ یوسف)

یوسف، تم اس سے اعراض کرو، اور تم اپنے گناہ کی مغفرت چاہو بے شک تو ہی خطاکاروں میں سے ہے۔

دیکھیے، ایک ہی سانس میں عزیز مصر نے حضرت یوسفؑ کو بھی خطاب کیا ہے اور اپنی بیوی کو بھی اور رخ کی تبدیلی اور جہات کی نوعیت سے خطاب کا فرق بغیر کسی التباس کے نمایاں ہو گیا۔

یہاں مسلمانوں کو مال غنیمت کے حلال و طیب ہونے سے متعلق جو اطمینان دلایا گیا وہ درحقیقت قریش کے جواب میں ہے۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ واقعۂ بدر کے بعد قریش نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ مسلمان مدعی بن کر تو اٹھے ہیں دینداری کے لیکن ان کے کام بالکل دنیا داروں کے ہیں۔ بھلا دین داروں کے یہی کام ہوتے ہیں کہ ملک میں خونریزی کریں، مال غنیمت لوٹیں، فدیہ وصول کریں اور اس کو مزے سے کھائیں؟ یہ تو وہی شیوہ ہے جو ہمیشہ سے دنیا داروں کا شیوہ ہے۔ قرآن نے یہ بتایا کہ تم ان مفتیوں کے فتوے کی ذرا پروا نہ کرو۔ ان کے نزدیک تو تم بہر شکل گنہگار رہو۔ اگر تم اس جنگ میں ہار جاتے تو تمھارا ہار جانا ان کے نزدیک تمھارے باطل ہونے کی دلیل بنتا اب جب کہ جیت گئے ہو تو تمھارا قیدی پکڑنا، مال غنیمت پانا

اور فدیہ وصول کرنا اور اس کو کھانا ان کے نزدیک تمہارے باطل پر ہونے کی دلیل ہے۔ ان لوگوں سے عہدہ برآ ہونے کی شکل بس یہ ہے کہ ان کی پروا نہ کرو اور اللہ نے جو فتوح تمہیں بخشی ہیں ان سے فائدہ اٹھاؤ، یہ تمہارے لیے حلال طیب ہیں۔

یہ امر یہاں ذہن میں رکھیے کہ اس زمانے میں عام طور پر مذہب کے رہبانی تصور کا غلبہ تھا اس وجہ سے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے نیک دل لوگ قریش کے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو جائیں جس کا اثر مسلمانوں کے اس ولولۂ جہاد پر پڑے جس کی اس سورہ میں دعوت دی جا رہی ہے۔ قرآن نے ان کی تردید کر کے اس امکان کا سدباب کر دیا۔

'وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ' مطلب یہ ہے کہ جو چیز جائز اور طیب ہے اس کو تو کھاؤ برتو البتہ اللہ سے ڈرتے رہو کہ کسی ایسی چیز میں آلودہ نہ ہو جاؤ جس سے خدا نے منع فرمایا ہے۔ اگر تم حدود الٰہی کے تجاوز سے بچتے رہے تو وہ تمہاری چھوٹی موٹی غلطیوں اور کوتاہیوں پر گرفت نہیں فرمائے گا، وہ غفور رحیم ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْۤ اَیْدِیْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤی اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ خَیْرًا یُّؤْتِكُمْ خَیْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَاِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ (۷۰-۷۱)

جنگ بدر کے قیدیوں سے خطاب

اب یہ بدر کے قیدیوں کے لیے ایک پیغام بھی ہے اور ساتھ ہی ایک دھمکی بھی۔ پیغام تو یہ ہے کہ تم سے جو فدیہ لیا گیا ہے اس سے دل گرفتہ ہونے کے بجائے تمہیں اللہ اور رسول کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ قتل کرنے کے بجائے تمہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ یہ تمہارے اوپر اللہ اور رسول کا بہت بڑا احسان ہے اور اس احسان کا حق یہ ہے کہ تم ٹھنڈے دل سے اپنے رویہ کا از سر نو جائزہ لو اور سارے معاملہ پر جذبات کے بجائے عقل و انصاف کی روشنی میں غور کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تم احسان کی قدر کرنے والے ہو گے اور تمہاری یہ سعادت اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی توفیق کو تمہاری طرف متوجہ کرے گی اور اس فدیہ سے جو تم سے لیا گیا ہے، کہیں بڑھ کر وہ تمہیں اسلام کی نعمت سے بخش دے گا اور تمہاری مغفرت فرمائے گا۔

'وَاِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ' الآیہ۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور بدر کے قیدیوں کو دھمکی ہے۔ پیغمبر کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر انھوں نے بے وفائی کی اور تم نے ان پر جو احسان کیا ہے اس کی قدر نہ پہچانی، پھر لڑنے کے لیے آئے تو یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے، اپنی ہی شامت بلائیں گے اس سے پہلے انھوں نے خدا سے بے وفائی و بدعہدی کی تو اس کا مزا انھوں نے چکھا کہ خدا نے ان کو تمہارے ہاتھ میں دے دیا۔ اگر یہی حرکت انھوں نے پھر کی تو خدا پھر انھیں قابو میں دے دے گا اور یہ اپنی اس بدعہدی کی سزا بھگتیں گے۔ یہاں جس بدعہدی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے

کہ اللہ نے ان کو اپنے حرم کا پاسبان بنایا اور ان کو ملتِ ابراہیم کی وراثت سپرد کی تو انھوں نے حرم کی حرمت برباد کی اور ملتِ ابراہیم کو مسخ کیا جس کے نتائج ان کے آگے آ رہے ہیں۔ اگر اپنے اس جرم پر یہ کچھ اور اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ شوق بھی کر لیں، اس کے پھل بھی یہ چکھیں گے۔

ان دونوں آیتوں پر غور کیجیے تو یہ بات واضح ہو گی کہ آنحضرتؐ نے بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر جو چھوڑ دیا تو نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ اس نے اس کو پسند فرمایا اور ان قیدیوں کو یہ پیغام بھجوایا کہ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اگر انھوں نے اس احسان کی قدر کی تو اس سے ان کے لیے قبولِ اسلام اور مغفرت کی راہیں کھلیں گی۔ غور کیجیے کہ کہاں یہ بات اور کہاں وہ جو محض بعض تفسیری روایات کی بنا پر مفسرین نے اختیار فرمائی کہ آنحضرتؐ پر اس بات کے لیے عتاب ہوا کہ اچھی طرح خون بہائے بغیر تم نے قیدی کیوں پکڑے اور فدیہ کیوں قبول کیا۔

۱۶۔ آگے کا مضمون —— آیات ۷۲-۷۵

اب آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ مسلمانوں کو ایمان و ہجرت کی اساس پر منظم ہو جانے اور ایمان و ہجرت ہی کو باہمی تعاضد و تناصر کی بنیاد قرار دینے کا حکم ہوا۔ جاہلیت کے خاندانی تعلقات اور ان کی ذمہ داریاں یک قلم ختم کر دی گئیں۔ حکم ہوا کہ جو لوگ ایمان لائیں، ہجرت کر کے مدینہ میں آ بسیں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر اہلِ کفر سے جہاد کریں وہ ایک ملت اور باہم دگر ایک دوسرے کے بھائی اور اولیاء ہیں۔ گویا اسلامی معاشرہ کو اس کی مخصوص اساسات پر منظم اور مستحکم کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ ملتِ کفر کے مقابلہ کے لیے انصار و مہاجرین ایک بنیانِ مرصوص کی طرح کھڑے ہو سکیں۔ اور مسلمانوں کو جہاد پر جو ابھارا گیا ہے یہ اس جہاد کی تیاری بھی ہے اور آگے والی سورہ میں کفار سے جو اعلانِ برأت ہونے والا ہے اس کی تمہید بھی۔
آیات کی تلاوت فرمائیے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ آیات
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ ۷۲-۷۵
أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن
وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ
فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم

مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ وَفَسَادٌ
كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ
هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ
بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ
عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾ ع

ترجمہ آیات ۷۲-۷۵

وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ باہم دگر ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لائے لیکن انھوں نے ہجرت نہیں کی تمہارا ان سے کوئی رشتۂ ولایت نہیں تا آنکہ وہ ہجرت کریں۔ اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے طالب مدد ہوں تو تم پر مدد واجب ہے الا آنکہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے مقابلے میں ہو جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھ رہا ہے اور جنھوں نے کفر کیا وہ آپس میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہیں تو اگر تم یہ نہ کرو گے تو ملک میں ظلم اور بڑا فساد ہو گا۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی، یہی لوگ پکے مومن ہیں۔ ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔ اور جو ایمان لائیں اس

کے بعد اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ جہاد میں شریک ہوں، یہ بھی تمہی میں سے ہیں اور رحمی رشتے والے اللہ کے قانون میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۷۲-۷۵

۱۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۷۲)

اسلام میں حمایت ونصرت کی بنیاد ایمان پر ہے

اسلام سے پہلے باہمی حمایت ونصرت کی بنیاد خاندانی و قبائلی عصبیت پر تھی۔ کوئی شخص یا خاندان کسی خطرے یا کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا تو اس کا خاندان یا قبیلہ اس کی حمایت ومدافعت میں سربکف ہوتا۔ اسلام نے مدینہ میں جو نیا معاشرہ قائم کیا اس میں حمایت ونصرت کی بنیاد ایمان اور ہجرت پر رکھی۔ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے، جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے مال وجان سے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہ باہم دگر ایک دوسرے کے یاور، ناصر اور حامی ومددگار ہیں۔ 'آمَنُوا وَهَاجَرُوا' سے ظاہر ہے کہ مہاجرین مراد ہیں اور 'آوَوا وَّنَصَرُوا' سے انصار۔ ان دونوں گروہوں کا ذکر ان کے اسماء واعلام کے بجائے ان کی صفات اور ان کی دینی خدمات سے کیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس نئی سوسائٹی میں خاندان ونسب کی عصبیت کے بجائے اقتدار صرف ایمان واسلام اور ہجرت وجہاد کا ہوگا۔ یہ ایک دوسرے کے ولی یعنی حامی وناصر ہیں۔ ظاہر ہے کہ حمایت ونصرت اہل کفر کے مقابل میں ہے۔ یہ بات اگرچہ بیان واقعہ کے اسلوب میں ہوئی ہے لیکن اس کے اندر امر کا مضمون بھی مضمر ہے یعنی یہ حکم ہے کہ اہل کفر کے مقابل میں اہل ایمان ایک دوسرے کے حامی ومددگار بن کر کھڑے ہوں اور جب ضرورت پیش آئے ایک دوسرے کی حمایت ومدافعت کریں۔

ہجرت کے بغیر کوئی مصالح

'وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا'

ان لوگوں کو جو اسلام تو لا چکے تھے لیکن ابھی انھوں نے دارالکفر سے دارالاسلام مدینہ کو ہجرت نہیں کی تھی اس رشتہ ولایت سے الگ رکھا یعنی دارالاسلام والوں پر ان کی حمایت ونصرت اور حفاظت ومدافعت

کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس ذمہ داری کے نہ اٹھانے کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ عملاً یہ ناممکن بھی تھا اور اس سے بہت سی بین الاقوامی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو سکتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس وقت مصلحت بھی تھی اور حکم بھی یہی تھا کہ تمام وہ لوگ جو اسلام لا چکے ہیں دار الکفر کے علاقوں سے نکل کر مدینہ میں مجتمع ہوں تاکہ اہل کفر سے نمٹنے اور بیت اللہ کی آزادی کے لیے منظم جد و جہد عمل میں آسکے۔

معاہدہ کا احترام

وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ یعنی ہر چند دار الاسلام والوں پر ان مسلمانوں کی حمایت و مدافعت کی ذمہ داری نہیں ہے جنھوں نے دار الکفر سے ہجرت نہیں کی ہے تاہم اگر وہ دین کے معاملے میں طالب مدد ہوں تو ان کو ممکن مدد بہم پہنچائی جائے بشرطیکہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے مقابل میں نہ ہو جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو۔ معاہدہ کا احترام مقدم ہے۔ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ یہ معاہدہ کے احترام کو مؤکد کرنے کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معاہدہ کے احترام کے منافی خفیہ یا علانیہ جو قدم بھی تم اٹھاؤ گے خدا اس سے بے خبر نہیں رہے گا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (۷۳)

دین میں دار الکفر کے مسلمانوں کی امداد کی وجہ

یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ خاص دین کے باب میں دار الکفر کے مسلمانوں کی مدد کرنا کیوں ضروری ہے؟ فرمایا کہ جہاں تک اسلام اور مسلمانوں کی عداوت کا تعلق ہے اس معاملے میں تمام کفار ایک دوسرے کے دست و بازو بن گئے ہیں۔ جو اللہ کا بندہ اسلام قبول کر لیتا ہے اس کی تعذیب و ایذا رسانی سب کے نزدیک کارِ ثواب ہے۔ یہاں تک کہ ظالموں کے ظلم سے اس کو بچانے کے لیے اس کے اپنے بھائی بندوں کی حمیت بھی مردہ ہو چکی ہے۔ اس کا مال اور اس کی جان سب مباح ہیں۔ ایسی حالت میں اگر تم بھی ان مظلوموں کی مدد نہ کرو گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دین سے پھرنے کے لیے سارے ملک میں ظلم و فساد عام ہو جائے گا۔ فتنہ کا لفظ یہاں (PERSECUTION) کے مفہوم میں ہے اور اِلَّا تَفْعَلُوهُ میں ضمیر مفعول کا مرجع وہی نصرت ہے جس کا ذکر فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ میں آیا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (۷۴)

دار الکفر کے مسلمانوں کے لیے ہجرت صداقت کی کسوٹی ہے

اس آیت میں ہجرت کو دار الکفر کے مسلمانوں کے لیے صداقت کی کسوٹی قرار دیا ہے۔ جب یہ فرمایا کہ سچے اور پکے مسلمان وہی ہیں جنھوں نے ہجرت اور جہاد کیا اور جنھوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ اسلام کی اصل دولت مہاجرین و انصار ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لا چکے ہیں لیکن ابھی انھوں نے دار الکفر سے ہجرت نہیں کی ہے، انھیں اپنے ایمان کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دار الکفر سے نکل کر دار الاسلام میں آئیں اور مہاجرین و انصار کے دوش بدوش جہاد میں شریک ہوں۔ اس سے ہجرت کی وہ غایت بھی واضح ہوئی جس

کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ اس کا اہم مقصد مسلمانوں کو جہاد کے لیے منظم کرنا تھا، دوسرے یہ اشارہ بھی نکلا کہ یہ ایمان و نفاق کے جانچنے کی کسوٹی بھی ہے۔ چنانچہ بعد والی سورہ ۔ سورہ توبہ ۔ میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جن لوگوں نے ایمان کے دعوے کے باوجود، آخر تک، بلا کسی عذر معقول کے ہجرت سے گریز اختیار کیا، ان کا شمار منافقین کے زمرے میں ہوا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۷۵)

دارالکفر کے مسلمانوں کو ترغیب، دارالاسلام کے مسلمانوں کو تنبیہ

یہ دارالکفر کے مسلمانوں کو ہجرت کی ترغیب و تشویق بھی ہے کہ تمہارے لیے بھی اسلامی معاشرہ کا یہ دروازہ کھلا ہوا ہے اس کی طرف سبقت کرو اور اس میں اپنا مقام حاصل کرو اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو تاکید بھی کہ بعد میں ایمان لانے والوں اور ہجرت کرنے والوں کے لیے بھی اپنے دلوں کے دروازے کھلے رکھو وہ بھی تمہارے ہی بھائی بند اور تمہارے ہی وجود ملی کے اجزا ہیں۔ نہ ان کے مقابل میں تمہارے اندر کوئی احساس برتری پیدا ہو، نہ دلوں میں کوئی تنگی۔

اولوالارحام کے شرعی حقوق مقدم ہیں

'وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ' یہ اخوت و نصرت کے اس عام ضابطہ کے ساتھ جو اوپر مذکور ہوا، حقوق اور وراثت کے اس خاص قانون کی یاددہانی کر دی گئی ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رحمی رشتوں کی بنا پر جو حقوق اللہ تعالیٰ نے قائم فرمائے ہیں وہ بدستور قائم رہیں گے۔ یہ اخوت اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گی۔ رحمی رشتوں کے حقوق کے ساتھ 'فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ' کی قید یہ بات واضح کرتی ہے کہ یہاں حقوق سے مراد رحم اور قرابت کے وہ حقوق ہیں جو اللہ کے قانون میں بیان ہوئے ہیں، وہ رسوم اس سے خارج ہیں جو جاہلیت میں رائج رہے ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی جہاں مسلمانوں کو اپنے دینی و اسلامی بھائیوں اور اولیاء کے ساتھ حسن سلوک، اور نصرت و اعانت، کی تاکید کی گئی ہے وہاں یہ تنبیہ کر دی گئی ہے کہ اولوالارحام کے شرعی حقوق مقدم رہیں گے۔ سورۂ احزاب میں ہے وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۶۔ احزاب (اور مومنین و مہاجرین میں رحمی رشتے والے ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، اللہ کے قانون میں، مگر یہ کہ تم اپنے اولیاء کے ساتھ کوئی حسن سلوک کرو، یہ چیز کتاب میں لکھی ہوئی ہے)۔

'اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ' مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہر بات اس کے بے خطا علم پر مبنی ہے اور ہر چیز کا اس نے ایک محل و مقام مخصوص کیا ہے۔ دینی اخوت و ولایت، کا اپنا دائرہ ہے اور رحمی قربت و قرابت، کا اپنا مقام ہے۔ اپنے اپنے محل میں دونوں کا احترام کرو اور خدا نے ان کے جو حقوق ٹھہرائے ہیں ان کو ادا کرو۔

اسلامی سیاست کے چند اصول

اس مجموعۂ آیات پر تدبر کی نظر ڈالیے تو ان سے اسلامی سیاست کے چند اصول سامنے آئیں گے جو بین الملی بھی ہیں اور بین الاقوامی بھی۔ ہم اختصار کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کریں گے۔

۱- ایک یہ کہ انصار و مہاجرین ایک دوسرے کے اولیاء ہیں ان کے درمیان ایمان اور ہجرت کا رابطہ اور اسی کی اساس پر اخوت اور حمایت و نصرت کے حقوق و فرائض ہیں۔ پچھلی خاندانی و قبائلی عصبیتیں ختم ہوئیں اور باہمی تعاضد و تناصر اور حمیت و حمایت کی اساس اسلامی اخوت پر استوار ہوئی۔

۲- جو لوگ ایمان لائے لیکن انھوں نے دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی وہ اس نئے اسلامی معاشرہ کے حقوق حمایت و نصرت میں شریک نہیں ہیں تا آنکہ وہ ہجرت کریں۔

۳- یہ دار الکفر میں پڑے ہوئے مسلمان اگر اسلام لانے کے جرم میں کہیں ستائے جا رہے ہوں تو ان کو ظلم سے بچانے کے لیے ان کی مدد کی جائے بشرطیکہ اس کے لیے کسی معاہد قوم سے جنگ نہ کرنی پڑے۔

۴- ہجرت ہر مسلمان پر واجب قرار دی گئی تاکہ مسلمان کفر کی طاقتوں سے مقابلہ کے لیے ایک مرکز میں مجتمع اور منظم ہو سکیں۔

۵- رحمی رشتوں کی بنا پر قرآن نے جو حقوق قائم کیے ہیں اسلامی اخوت کے حقوق ان پر اثر انداز نہ ہوں گے۔ وہ بہر حال مقدم رہیں گے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوتی ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

لاہور

۱۹ر فروری ۱۹۶۹ء